اقبال اور نژادِ نو

مجموعۂ مقالات

ڈاکٹر آغا یمین

بزمِ اقبال، کلب روڈ، لاہور

اقبال اور نژادِ نو

مجموعۂ مقالات

ڈاکٹر آغا یمین

بزمِ اقبال، کلب روڈ، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول : جون ۱۹۸۶ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : احمد ندیم قاسمی
اعزازی سیکرٹری بزمِ اقبال ، لاہور

طابع : سید ظفرالحسن رضوی

مطبع : ظفر سنز پرنٹرز ، کوپر روڈ ، لاہور

قیمت

فہرست

برسبیلِ تذکرہ : از پروفیسر محمد منور . . . ۱

پیش لفظ : از ڈاکٹر وحید قریشی ۷

مقدمہ : از مصنف ۹

۱ - علامہ اقبال اور احترامِ آدمیت ۲۷

اقبال کا تدریجی فکری ارتقا ۲۷

فکرِ اقبال کا ابتدائی دور ۲۷

اقبال کی حب الوطنی ۲۸

اقبال کا فکرِ ملی ۲۹

گردِ مغرب اور اہلِ مشرق ۳۱

آخری منزل احترامِ آدمیت ۳۲

۲ - اقبال ، مزدور ، لینن ، کارل مارکس اور سعدی . ۳۷

لینن اور اقبال ۳۷

لینن (خدا کے حضور میں) ۳۹

فرمانِ خدا ۳۹

کارل مارکس اور اقبال ۴۱

انقلاب ، مزدور اور اقبال ۴۲
درسِ انسانیت ــ سعدی اور اقبال ۴۳

۳ ۔ اقبال اور ملا شاہ لاہوری کا فلسفۂ خود شناسی . ۴۷
ملا شاہ ، مولانا روم اور فلسفۂ نے ۵۱
مولانا روم ، ملا شاہ ، اقبال اور فلسفۂ خود شناسی ۵۳
مولانا روم اور ملا شاہ لاہوری ۵۵
ملا شاہ اور اقبال ۵۸

۴ ۔ علامہ اقبال اور سلطان باہو کے کلام میں "ھُو" کی
علامت ۶۱
سلطان باہو کا تعارف ۶۱
سلطان باہو کا فلسفۂ توحید ۶۳
باہو کے کلام میں "ھُو" کی علامت ۶۵
علامہ اقبال کے کلام میں "ھُو" کی علامت . . ۶۶
سلطان باہو کے پنجابی کلام میں "ھُو" کی علامت . ۶۸
"ھُو" کی روحانی اور معنوی علامت . . . ۶۹

۵ ۔ اقبال اور پاکستانی نوجوان ۷۷
حکیمِ ملت ۷۷
دیدۂ بینا ۷۷
مسلم نوجوان ۷۸
طلوعِ اسلام ۸۰

ملّتِ بیضا کی شیرازہ بندی ۸۲
یقینِ محکم ۸۴
پاکستانی نوجوان اور دنیائے اسلام ۸۵
۶ - اقبال ، گورنمنٹ کالج اور علامہ اقبال یونیورسٹی . ۸۹
لاہور کی تاریخی حیثیت ۸۹
گورنمنٹ کالج لاہور کی تاریخی ، علمی اور ادبی حیثیت ۹۱
پنجاب یونیورسٹی کا بانی گورنمنٹ کالج لاہور . . ۹۳
علامہ اقبال اور گورنمنٹ کالج لاہور . . . ۹۴
مجلسِ اقبال گورنمنٹ کالج لاہور ۹۷
علامہ اقبال یونیورسٹی کا قیام ۹۸
۷ - اقبال ایران کی نظر میں ۱۰۳
۸ - اقبال اور صادق سرمد شاعرِ ملی ایران . . . ۱۱۵
صادق کا تعارف ۱۱۶
اقبال اور سرمد ۱۱۸
۹ - اقبال اور اتحادِ عالمِ اسلامی ۱۲۵
۱۰ - اسلامی بلاک ــ اقبال کی نظر میں ۱۳۳
پین اسلامزم اور سید جمال‌الدین افغانی . . . ۱۳۸
پین اسلامزم کا مفہوم ۱۳۸
پین اسلامزم کا مشتبہ مفہوم ۱۴۰

اقبال اور سید جمال الدین افغانی ۱۴۲
اقبال اور عصر حاضر ۱۴۴
اقبال کا آپٹیمزم یعنی رجائیت ۱۴۵
اقبال کا پیام عصرِ حاضر کے نام ۱۴۵

★ ★ ★

انتساب

مسلم نوجوانوں کے نام

جو ہمارا مستقبل ہیں

برسبیلِ تعارف

ڈاکٹر آغا محمد یمین صاحب سے شناسائی کا آغاز آج سے تقریباً تیس برس قبل ہوا۔ میری طرح آغا صاحب بھی اورینٹل کالج لاہور کے سابق طالب علم ہیں لہٰذا میرے ہم مکتب ہیں۔ پھر وہ میرے ہی بعض مکرم اساتذہ کے شاگرد رہے ہیں لہٰذا میرے استاد بھائی ہیں۔ ہم دونوں ہمدرس کبھی نہیں رہے، البتہ سال ہا سال گورنمنٹ کالج لاہور میں ہم تدریس ضرور رہے ہیں۔ اسی طرح ہم دونوں ہم محلہ بھی ہیں کہ آغا صاحب اور میں دونوں کرشن نگر (حال اسلام پورہ) کے باسی ہیں۔ دونوں ہم قلم بھی ہیں کہ بارہا کرشن نگر سے کالج اور کالج سے کرشن نگر اکٹھے پیدل چلتے رہے ہیں —— یہی نہیں، ہم دونوں گورنمنٹ کالج کے ادبی و علمی ارمغان ''راوی'' میں اکٹھے چھپتے رہے ہیں، اس لیے ''ہم مجلہ'' بھی ہیں۔ مطلب یہ کہ آغا صاحب کے ساتھ اس نیازمند کا رابطہ کئی نسبتوں پر استوار ہے۔

آغا صاحب نے فارسی میں پی ایچ۔ڈی کی معزز علمی سند حاصل کی۔ موضوعِ تحقیق تھا ''تاریخِ شعرِ فارسی در لاہور'' —— آغا صاحب کو فارسی زبان سے بے پناہ لگاؤ ہے۔ ایران کی زیارت بھی کر چکے ہیں۔ اہلِ زبان کی طرح فارسی میں گفتگو پر قادر ہیں۔ آغا صاحب کو اردو اور پنجابی زبان سے بھی شغف ہے۔ آپ فارسی، اردو اور پنجابی میں فقط نثر ہی نہیں لکھتے، شعری بھی کرتے ہیں ——

طبیعت بے تکلف پائی ہے - ہنس مکھ اور بھلے آدمی ہیں - میل ملاقات کے باب میں بڑے باہمت واقع ہوئے ہیں - آج تک انھیں کسی سے لڑتے یا بگڑتے ہوئے نہیں دیکھا گیا -

ڈاکٹر آغا محمد یمین صاحب کو حضرت علامہ اقبال کے فکر و فن سے بے پناہ لگاؤ ہے - یہ تو عیاں ہے کہ حضرت علامہ کے اشعار اردو میں بھی ہیں اور فارسی میں بھی ، بلکہ فارسی میں اردو کے مقابلے میں زیادہ ہیں ، لہٰذا آغا صاحب دوہرا حظ اٹھاتے ہیں -

آغا صاحب نے حرفِ آغاز میں اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ انھیں حضرت علامہ اقبال کے کلام سے عہد طفلی میں بھی شغف تھا - یہ شغف رفتہ رفتہ عقیدت میں تبدیل ہو گیا - یہی باعث ہے کہ انھوں نے حضرت علامہ کو موضوع بنا کر فارسی ، اردو اور پنجابی تینوں زبانوں میں بارہا حقِ عقیدت ادا کرنے کی سعی فرمائی ہے -

زیر نظر کتاب میں دس مقالات ہیں - آغا صاحب اقبالیات کے طلبہ کے لیے بطور معلم اپنی بات قابلِ فہم بنا دینا چاہتے ہیں - ''احترامِ آدمیت'' ، ''پاکستانی نوجوان'' اور ''اتحادِ عالمِ اسلامی اور اسلامی بلاک'' وہ موضوعات ہیں جن کو خالصتاً حضرت علامہ کے افکار کی روشنی میں بیان کیا گیا ہے - یہ موضوعات چلے بھی بارہا اہلِ فکر و نظر کی توجہ کا مرکز بنے ہیں - یہ الگ بات ہے کہ ان کی اہمیت حضرت علامہ کے ہر عقیدت مند طالب العلم کی نظروں میں اس قدر زیادہ ہے کہ وہ ان پر نظر ڈالے بغیر اور ان پر اظہار خیال کیے بغیر رہ نہیں سکتا - خصوصاً وہ طلبۂ اقبالیات جو استاد کے منصب پر فائز ہوں اور ساتھ ہی انسانیت کی مثبت قدروں پر

دین اسلام کی روشنی میں ایمان رکھتے ہوں ـــــ یہ بجا ہے کہ بعض اشعار اس قدر زباں زدِ عام ہوتے ہیں کہ انھیں ''پامال'' اشعار کہا جانے لگتا ہے مگر یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ اگر وہ اشعار دلجو بلکہ ہر دلعزیز نہ ہوتے تو زبان زدِ عام نہ ہوتے۔ چنانچہ یہ موضوعات بھی اپنی اہمیت کے باعث اس کتاب کا حصہ ہیں۔

اس تصنیف میں آغا صاحب نے بعض ایسے مضامین بھی شامل فرمائے ہیں جن کو ایک حد تک اچھوتا قرار دیا جا سکتا ہے۔ ''اقبال، مزدور، لینن، کارل مارکس اور سعدی''۔ یوں تو اقبال اور مزدور یا اقبال اور لینن یا کارل مارکس پر کئی اہلِ قلم نے اظہارِ خیال کیا ہے مگر آغا صاحب نے حضرت علامہ کے موقف کی تائید میں شیخ مصلح الدین سعدی شیرازیؒ کو بھی لا کھڑا کیا ہے، جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ مسلمان اہلِ نظر کے نزدیک محنت کش مزدور اور کاسب مقامِ بلند پر فائز ہے۔ نبی اکرمؐ کا ارشاد گرامی ہے ''الکاسب حبیب اللہ'' (یعنی محنت مزدوری کر کے روزی کمانے والا شخص اللہ کا محبوب ہے) جس کا بالواسطہ مفہوم یہ ہوا کہ دوسروں کی محنت پر پلنے والے، نکھٹو، ناکردہ کار اور کام چور ناپسندیدہ لوگ ہیں۔ جو لوگ کچھ نہیں کرتے وہ زندہ وجود نہیں ہیں، وہ فقط سانس لینے والے مُردے ہیں۔

حضرت مُلاّ شاہ لاہوری کو عام اہلِ علم زیادہ نہیں جانتے۔ آغا صاحب نے حضرت علامہ کے توسط سے ان بزرگوار کا تعارف بھی کروایا ہے۔ اسی طرح آغا صاحب نے حضرت سلطان العارفین سلطان باہوؒ اور علامہ اقبال کے ''اللہ ھو'' کی جذبی مناسبت کو بھی واضح

کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس موضوع پر پروفیسر محمد سلیم صدر شعبۂ عربی و اسلامیات گورنمنٹ کالج لاہور بھی اپنے ایک مقالے میں، جو "نوائے وقت" میں چھپا تھا، روشنی ڈال چکے ہیں۔ بہرحال آغا صاحب کی اپنی کوشش ہے اور عیاں ہے کہ یہ موضوع بھی نیازمندانِ اقبال کے لیے نیا ہے۔

اسی طرح "علامہ اقبال اور صادق سرمد ـــــ شاعرِ ملیِ ایران" بھی اہلِ پاکستان کے لیے جدید موضوع ہے۔ جدید ایرانی ادب سے دلچسپی رکھنے والے کئی اصحاب نے ایران میں علامہ اقبال کی مقبولیت کے عنوان پر قلم اٹھایا ہے۔ خصوصاً ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید عرفانی صاحب نے اس باب میں بڑی محنت اور کاوش صرف کی ہے جو نہایت قابلِ قدر ہے۔ آغا صاحب نے بھی ہماری معلومات میں اضافہ کیا ہے۔

قدرتی امر ہے کہ ہم پاکستانی مسلمانوں کو خوشی ہوتی ہے جب پاکستان کے باہر کی مسلم مملکتوں میں علامہ اقبال کے کلام کی پزیرائی سے متعلق معلومات مہیا ہوں۔ حضرت علامہ کا کلام ایک صاحبِ ایمان کا بیان ہے لہٰذا وہ جملہ اہلِ ایمان کے لیے ہے، اور اہلِ ایمان کسی خاص زمین، نسل، رنگ یا زبان سے وابستہ نہیں۔ مسلمان معاشرہ ایک بین الاقوامی اور بین الانسانی سوسائٹی ہے۔ اس معاشرے کے اتحاد کی اساس مادی نہیں روحانی ہے۔ یہ عقیدے میں اشتراک، ہم نظری اور یک‌جہتی کا مظہر ہے۔ اس اعتبار سے اسلام سارے عالمِ انسانیت کا دین بننے کی اہلیت رکھتا ہے۔ یہ جغرافیائی اور نسلی دین نہیں، یہ فوق الاقوام اور فوق الاوطان ہے لہٰذا آفاقی ہے۔ تاہم یہ طبعی حقیقت ہے کہ کلامِ اقبال کی رُوح سے جس طرح

اہلِ اسلام سرشار ہوتے ہیں اس طرح غیر مسلم سرشار نہیں ہو سکتے۔ ہم عقیدہ ہونے کے باعث حضرت علامہ کے فرمودات اہل اسلام کے دلوں میں بغیر فکری کاوش کے اتر جاتے ہیں جبکہ غیر مسلموں کو نسبتاً زیادہ کاوش کرنا پڑتی ہے۔ ایران، افغانستان، شام، مصر اور ترکی میں کلامِ اقبال کی پذیرائی اسی وجہ سے نسبتاً زیادہ ہے۔

ایران اور افغانستان کے دین داروں کے مجاہدات کو خود انھی مجاہدین کے سربراہوں کے بقول علامہ اقبال کے حریت آموز کلام نے روحِ تازہ سے نوازا ہے۔ ترکی اور مصر میں کلامِ اقبال کے مطالعاتی حلقے روز افزوں ہیں۔ بے شک روحِ اسلام تک رسائی کلامِ اقبال کی معرفت بہت آسان ہو جاتی ہے۔ پھر جس دل میں روحِ اسلام داخل ہو اس دل پر سے خوف، غم اور تشکک کا سایہ دور ہو جاتا ہے۔ کلامِ اقبال سے سرشار دل کبھی بھی یاس آشنا نہیں ہوتے۔ وہ دل فقط اپنے ہی باب میں نہیں، بلکہ عالمِ اسلام اور عالمِ انسانیت کے مستقبل کے ضمن میں بھی ہمیشہ پر امید رہتے ہیں۔

کلامِ اقبال کی آدمیت آموز روح کا فرحت بخش اثر غیر مسلم معاشروں کے اہلِ نظر کو بھی متاثر کرتا جا رہا ہے۔ آج دنیا میں ایک دو نہیں متعدد غیر مسلم ممالک میں مطالعۂ اقبال کے حلقے موجود ہیں۔ ترجمانِ اسلام اور ترجمانِ انسانیت کی حیثیت سے کلامِ اقبال کی مقبولیت میں ہمارے تخمینوں سے بڑھ کر اضافہ ہو رہا ہے۔ عالمِ انسانیت روحِ عصر کی مادیت مآبی کی بدولت خود آزار و خود بیزار ہو رہا ہے۔ آمادۂ خودکشی عالمِ انسانیت کو اخلاقی اور روحانی سہاروں کی ضرورت ہے تاکہ بے حال خود اعتمادی بحال ہو جائے۔ فکر و کلامِ اقبال کی عطا کردہ سرشاری بہت بڑا سہارا ہے۔

ڈاکٹر آغا محمد یمین صاحب اپنے ان مقالات کے ذریعے معاصر مسلمان معاشروں کو حضرت علامہ اقبال کے روح پرور ارشادات کی مدد سے مفہومِ حیات سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ خدا انھیں کامیاب کرے، خدا انھیں مزید ہمت اور مزید خلوص سے نوازے۔

۲۳ مارچ ۱۹۸۳ء

(پروفیسر) محمد منور
صدر شعبۂ اقبالیات، جامعۂ پنجاب
لاہور

پیش لفظ

ڈاکٹر آغا یمین خان صاحب طویل عرصے سے درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں ۔ فارسی زبان و ادب کے معلم کی حیثیت سے علامہ اقبال کی شاعری اور ان کے افکار و نظریات سے ان کی دلچسپی ایک قدرتی امر ہے ۔ زیر نظر مجموعے کے مضامین آغا صاحب کی اسی دلچسپی اور دل بستگی کا مظہر ہیں ۔

ان مضامین میں انھوں نے فکر اقبال کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ۔ ان کے مخاطب زیادہ تر پاکستانی نوجوان ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے اس مجموعے کا انتساب بھی ''نوجوان نسل'' کے نام کیا ہے ۔ فی الحقیقت نئی نسل کے لیے پیغامِ اقبال کو سمجھنا اور عملی زندگی میں اسے بروئے کار لانا وقت کا اہم تقاضا ہے ۔ اس اعتبار سے آغا یمین کے یہ مضامین پاکستانی طلبہ اور نوجوانوں کے لیے تفہیمِ اقبال میں مفید ثابت ہوں گے ۔ امید ہے انھیں وہ پزیرائی حاصل ہوگی جس کے وہ مستحق ہیں ۔

۳ اکتوبر ۱۹۸۲ع

ڈاکٹر وحید قریشی

مقدمہ

کلامِ اقبال کا مطالعہ میں نے ابتدائی تعلیم کے زمانے سے ہی شروع کر دیا تھا ۔ اگرچہ میرا مولد لاہور ہی تھا اور میری زندگی کا بیشتر حصہ اسی شہر لاہور میں بسر ہوا ، لیکن میری ابتدائی زندگی کا زمانہ لودھیانہ میں گزرا ۔

سنہ ۱۹۳۸ء کی بات ہے ، میں گورنمنٹ ہائی سکول لودھیانہ میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا ۔ یہ حکومتِ برطانیہ کا وہ زمانہ تھا جس میں علامہ اقبال کے کلام ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' نے اس دور کی مسلمان نوجوان نسل کو جذبۂ بیداری سے سرشار کردیا تھا ۔ ہم طلبا ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' کے اکثر اشعار ازبر کر کے نہایت جوش و خروش سے پڑھتے اور لوگوں کو سناتے تھے ۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ بعض اوقات ان اشعار کے پڑھنے سے ہم نوجوانوں کے دل پر رقت طاری ہو جاتی تھی اور ہماری آنکھوں میں آنسو اُمڈ آتے تھے ۔ یہ کیفیت محض میری ہی نہیں بلکہ اُس دور کے اکثر مسلمان نوجوانوں کی تھی ۔ اُس وقت سے لے کر آج تک کلامِ اقبال کا مطالعہ میری زندگی کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد رہا ہے ۔

در حقیقت یہ علامہ اقبال کا کلام ہی تھا جس نے اُس دور کے مسلمان نوجوانوں میں وہ جذبۂ بیداری پیدا کیا جس سے بانیِ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کے لیے کام آسان ہوگیا ۔ قائد اعظم جانتے تھے کہ اقبال کے کلام نے ہندوستانی مسلم نوجوان نسل

میں وہ جذبۂ بیداری پیدا کر دیا ہے جو تشکیلِ پاکستان میں سب سے زیادہ ممد و معاون ثابت ہوگا ۔ یہ وہی جذبہ تھا جس کے زیرِ اثر ''مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن'' میں جذبۂ آزادی اور تیز ہوگیا اور ہم مسلمان نوجوانوں نے یہ نعرہ لگایا : "لے کے رہیں گے پاکستان'' ـــــ ''دینا پڑے گا پاکستان" ـــــ ''پاکستان کا مطلب کیا ؟ لا الہ الا اللہ" ۔

مجھے وقت اور جگہ تو یاد نہیں لیکن آج بھی وہ منظر ضرور یاد ہے جب بانیٔ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے "مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن'' سے خطاب کیا ۔ اُن کی تقریر کا ایک جملہ ذہن سے ہوتا ہوا دل کی گہرائی میں اس طرح پیوست ہوچکا ہے کہ برسوں گزرنے کے بعد آج بھی حفظ ہے ، لہذا میں قائد اعظم کا فرمان انھی کے الفاظ میں درج کرتا ہوں :

"Look here gentlemen, it is not I, it is you and you only, who will make Pakistan and you are the pillars of the coming Pakistan."

نہ جانے قائد اعظم کے مذکورہ الفاظ میں کیا جادو تھا کہ واقعی ''مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن'' کے نوجوانوں نے پاکستان بنا کر ہی چھوڑا ۔ خدا کے فضل و کرم سے یہ ملک خدا داد مٹنے کے لیے نہیں بلکہ ہمیشہ قائم و دائم رہنے کے لیے بنا ہے ۔ جہاں تک میں نے علامہ اقبال کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ انشاءاللہ العزیز وہ وقت جلد آ رہا ہے جب کہ پاکستان نہ صرف اپنے قدموں پر کھڑا ہوگا بلکہ وہ دنیائے اسلام کی رہنمائی کرے گا اور علامہ اقبال کی یہ پیش گوئی

حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوگی :

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

اور یہ کہ :

آگہ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اور یہ کہ :

یہ نکتہ سرگزشتِ ملت بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

لیکن اس کے ساتھ ساتھ علامہ اقبال نے یہ افکار خوش فہمی کے تحت پیش نہیں کیے بلکہ ہماری آنے والی نئی نسل کو عمل کا یہ پیغام بھی دیا ہے کہ :

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

مقصودِ تصنیف :

اس کتاب کی تصنیف کا مقصد بھی یہی ہے کہ مجھ جیسے لوگ جنھوں نے "مسلم سٹوڈنٹ فیڈریشن" میں رہ کر قائدِ اعظم کی زیرِ قیادت پاکستان کو قائم کیا ہم اپنی آنے والی نسل کو یہ بتائیں کہ درحقیقت وجودِ پاکستان کا پس منظر علامہ اقبال ہی کا وہ کلام ہے جس نے برطانوی راج میں مسلم نوجوانوں میں جذبۂ بیداری پیدا کر کے انھیں غلامی کی زنجیریں توڑنے کے قابل بنایا اور اب یہی وہ کلام ہے جو ہماری آنے والی نوجوان نسل کو صداقت ،

عدالت اور شجاعت پر عمل کر کے دنیا کی امامت کرنے کا سبق دیتا ہے۔

لہٰذا ہم نے اس کتاب میں علامہ اقبال کے کلام کے انھی موضوعات پر بحث کی ہے جن کے پڑھنے سے پاکستان کی آنے والی نوجوان نسل کو اقبال کے کلام سے نہ صرف شناسائی ہو سکے گی بلکہ اُن میں یقیناً وہ جذبۂ ملی پیدا ہوگا جس کے زیر اثر وہ پھر سے اسلامی اقدار کو اپنا کر دنیا کی امامت کر سکیں گے۔

اقبال کا تدریجی فکری ارتقاء :

ویسے تو میرے متعدد مقالات ''اقبال ریویو'' لاہور اور دیگر رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں لیکن ان تمام میں سے چند ایک جو زیرِ نظر کتاب کے موضوع کے زیرِ اثر لکھے گئے، شامل کیے گئے ہیں۔ لہٰذا میں سب سے پہلے اس کتاب کا آغاز اپنے اُس مقالے سے کرتا ہوں جسے میں نے پنجاب یونیورسٹی لاہور کی جانب سے ۲ تا ۸ دسمبر ۱۹۷۷ء کو ہونے والی ''علامہ اقبال بین الاقوامی کانگریس'' انٹر کانٹینٹل ہوٹل لاہور میں بعنوان ''علامہ اقبال اور احترامِ آدمیت'' پڑھا تھا اور جو بعد میں مذکورہ کانگریس کے مقالات کی جلد چہارم میں شائع ہوچکا ہے۔

۱۔ علامہ اقبال اور احترامِ آدمیت :

میں نے اس کتاب کے مقالے بعنوان ''علامہ اقبال اور احترام آدمیت'' میں علامہ اقبال کے افکار کے تدریجی مدارج پر بحث کی ہے، جس سے علامہ اقبال کی شخصیت کی مکمل عکاسی ہوتی ہے۔ اس کا آغاز میں نے اقبال کے تدریجی فکری ارتقا کے عنوان سے

کیا ہے - پہلے فکرِ اقبال کے ابتدائی دور پر بحث کی ہے جس میں اقبال کی ''حب الوطنی'' کا ذکر بھی کیا ہے - بعد ازاں اقبال کس طرح وطنیت کے دائرے سے نکل کر فکرِ ملی کی طرف آتے ہیں ، خود اقبال کے حوالے سے ہی اس کی توضیح کی ہے- پھر ''لردِ مغرب اور اہلِ مشرق'' کے عنوان سے بحث کرتے ہوئے علامہ اقبال کے تدریجی فکر کی آخری منزل ''احترامِ آدمیت'' پر بحث کی ہے - یہی وہ تدریجی فکری مدارج ہیں جن کے سمجھنے سے علامہ اقبال کی مکمل شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے -

۲- اقبال ، مزدور ، لینن ، کارل مارکس اور سعدی :

اس سلسلے کا دوسرا اہم مقالہ ''اقبال اکیڈیمی لاہور'' کے ''اقبال ریویو'' (اکتوبر ۱۹۷۷ء) میں بعنوان ''اقبال مزدور ، لینن ، کارل مارکس اور سعدی'' شائع ہوا تھا -

اس مقالے میں ، میں نے بھٹکی ہوئی مسلم نوجوان نسل کو اشتراکیت ، وطنیت ، قومیت اور ہر قسم کی ازم سے نکل کر علامہ اقبال کے کلام کے حوالے سے صراطِ مستقیم کی طرف لوٹنے کی دعوت دی ہے - علامہ اقبال کے کلام کے حوالوں سے ہی لینن اور کارل مارکس کے انسان دوستی کے ان دعووں پر بھی بحث کی ہے جہاں ''لینن خدا کے حضور میں'' انتہائی حسرت و یاس سے یہ گلہ کرتا ہوا سنائی دیتا ہے :

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

اگر ہم مندرجہ بالا لینن کے اس فلسفے پر بحث کریں تو معلوم

ہوگا کہ یہاں لینن کو خود سمجھ نہیں آتا کہ آخر سرمایہ پرستی کا یہ سفینہ کب ڈوبے گا ؟ ـــــ بہ الفاظ دیگر وہ امیر اور غریب کی طبقہ بندی کو توڑ کر انسانی مساوات کا خواہاں دکھائی دیتا ہے ، لیکن وہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ ایسا کب ہوگا ؟

علامہ اقبال اس فلسفے کو حل کرنے کے لیے کارل مارکس اور لینن اور مغرب کے دیگر تمام فلسفیوں کو پڑھتے ہیں تو انہیں اس کا کوئی حل نظر نہیں آتا ۔ پھر وہ اہل مشرق میں سے اپنے مفکرین مولانا روم ، امام غزالی اور شیخ سعدی کے افکار کا مطالعہ کرتے ہیں تو انہیں شیخ سعدیؒ ایسے مفکرِ اسلام دکھائی دیتے ہیں جو انسان دوستی کا ایک ایسا فلسفہ پیش کرتے ہیں جہاں کسی کو شک و شبہہ کی گنجائش نہیں رہتی اور فلسفۂ انسان دوستی ایک آئینے کی مانند صاف اور روشن دکھائی دیتا ہے جو عین فطرتِ خداوندی کے مطابق ہے ۔ جہاں امیر اور غریب ، مزدور اور فرماں روا ، حاکم و محکوم سب کا فطرتِ ایزدی کے مطابق ہونا لازم بھی ہے ۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ سب ایک ہی صف میں کھڑے ہوئے دکھائی بھی دیتے ہیں ۔ اس فلسفے کا حل شیخ سعدیؒ نے یوں کیا ہے :

بنی آدم اعضای یک دیگراند
کہ در آفرینش زیک گوہراند

چو عضوی بدرد آورد روزگار
دگر عضو ہا را نماند قرار

تو کز محنتِ دیگراں بی غمی
نشاید کہ نامت نہند آدمی

آدم کی اولاد خواہ وہ سرمایہ دار ہو یا کاری گر ، وہ عالم ہو یا جاہل ، وہ امیر ہو یا غریب وہ سب ایک دوسرے کے محتاج ہیں جس سے مکمل انسانی معاشرہ معرضِ وجود میں آتا ہے ۔ شیخ سعدی نے اولادِ آدم کی بہترین مثال مکمل جسد انسانی کے اعضاء سے دی ہے اور فرمایا ہے کہ طبیعی اعتبار سے سب لوگ انسان کے جسم کے اعضا کی مانند ہیں جو ایک دوسرے کے لیے جزوِ لاینفک کی طرح آپس میں منسلک ہیں لہذا اُن کو ایک دوسرے کا اس طرح ہمدرد ہونا چاہیے جیسے انسان کے جسم کے اعضا ایک دوسرے کے ہمدرد ہوتے ہیں ۔ مثلاً جب کبھی جسم کے ان اعضاء میں سے کسی ایک عضو کو تکلیف پہنچتی ہے تو فطری اعتبار سے جسم کے دوسرے تمام اعضاء کو بھی چین نصیب نہیں ہوتا ۔

لہذا اصل مسئلہ امیر یا غریب کی طبقہ بندی کے ختم کرنے کا نہیں بلکہ اصل مسئلہ انسانوں کے ایک دوسرے کے درد کو محسوس کر کے اُس کا حل تلاش کرنا ہے ۔ اولاد آدم کو ایک ملت یا قوم کی صورت میں جسدِ انسانی سے تعبیر کر کے شیخ سعدی نے اس کا حل دو صورتوں میں پیش کیا ہے ، پہلی صورت تو یہ ہے کہ انسانی معاشرے میں کارفرما ، اور کارگر، امیر، سرمایہ دار اور مزدور ، حاکم و محکوم ، لباس بنانے والا اور جوتا پہننے والا ، عالم ، فاضل ، سبھی طبقات کے لوگوں کا ہونا ازبس ضروری ہے جن کے باہمی اتحاد سے انسانی معاشرہ مکمل طور پر معرضِ وجود میں آتا ہے ، مثلاً اگر جسدِ انسانی میں سر نہ ہو تو محض انسان کا دھڑ نظر آئے گا ، اگر پاؤں نہ ہوں تو بھی انسان مکمل نہیں ، وہ لنگڑا کہلائے گا ۔ اسی طرح اگر معاشرے میں کوئی فرمانروا نہ ہو تو اُس کا نظام نہیں چل سکتا ۔ اگر کارگر نہ ہو تو معاشرے میں کوئی کام نہ ہوگا اور معاشرہ ناکارہ ہو کر رہ جائے گا ۔

یہاں شیخ سعدی نے سر کو فرماں روا سے تعبیر کیا ہے اور پاؤں کو کارگر سے ، لیکن اگر پاؤں میں ذرا سا کانٹا چبھ جائے تو تمام سر درد کرنے لگتا ہے ، درد سے بے چین ہوجاتا ہے ، یہاں تک کہ آنکھ سے آنسو بہہ نکلتے ہیں ۔ لہذا مسئلہ غریب اور امیر کی طبقہ بندی کو ختم کرنے کا نہیں بلکہ ایک انسان کا دوسرے انسان کی تکلیف محسوس کر کے اس کی تکلیف کو دور کرنے سے حل ہوتا ہے ، خواہ وہ امیر ہو یا غریب اور یہی فطرتِ ایزدی کا تقاضا ہے ، اسی لیے سعدی نے فرمایا کہ :

تو کز محنت دیگراں بی غمی
نشاید کہ نامت نہند آدمی

اے انسان اگر تجھے دوسرے انسانوں کی تکلیف کا احساس نہیں اور تو ان کی تکلیف سے بے غم ہے تو تُو انسان کہلانے کا مستحق نہیں ۔

یہی وہ فلسفۂ انسان دوستی ہے جسے علامہ اقبال نے شیخ سعدی سے رہنمائی لے کر "بانگ درا" میں بعنوان ''شاعر" یوں بیان کیا ہے :

قوم گویا جسم ہے افراد ہیں اعضائے قوم
منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفلِ نظم حکومت ، چہرۂ زیبائے قوم
شاعرِ رنگین نوا ہے ، دیدۂ بینائے قوم
مبتلائے درد کوئی عضو ہو ، روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

اسی طرح ''پیام مشرق'' میں ایک نظم بعنوان ''محاورہ مابین حکیم فرانسوی اگسٹس کومٹ و مردِ مزدور'' میں شیخ سعدی کے اسی شعر کی تضمین کے ساتھ یوں مسئلہ حل کیا ہے :

''بنی آدم اعضائے یک دیگراند''
ہمان نخل را ، شاخ و برگ و براند

جس طرح انسان بنی آدم کے اعضا کی مانند ہیں اسی طرح اس کی دوسری مثال ایک درخت سے دی جا سکتی ہے کہ درخت تو ایک ہی ہے لیکن اس کی شاخیں اور پتے اپنی اپنی جگہ جدا جدا بھی ہیں اور ایک درخت کی شکل میں ایک بھی ہیں ۔ یہ فلسفۂ انسان دوستی ایسا ہے جسے نہ ہی تو کوئی مارکسی فلسفہ اور نہ ہی کوئی ازم حل کر سکا ، البتہ اسلامی فلسفہ جو فطرت انسانی کے عین مطابق ہے ، اسے ایسے واضح اور روشن انداز میں پیش کرتا ہے جس کے بعد کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی ۔

۳۔ **اقبال اور مُلاّ شاہ لاہوری :**

اس کتاب کا تیسرا اہم مقالہ بعنوان ''اقبال اور مُلاّ شاہ لاہوری'' ہے جسے ''بزم اقبال لاہور'' نے اپریل/جولائی ۱۹۷۷ء کے سہ ماہی مجلہ اقبال میں شائع کیا تھا ۔

یہ مقالہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک نیا موضوع لیے ہوئے ہے ۔ اس میں شاہجہانی دور کے معروف شاعر ملا شاہ لاہوری کے فلسفۂ خود شناسی پر بحث کی گئی ہے ۔ علاوہ ازیں اس میں جو قابلِ ذکر بات ہے وہ یہ کہ ملا شاہ لاہوری برصغیر پاک و ہند کے ان نامعلوم شعرا میں سے ایک ہیں جن کا کلام تاحال شائع نہیں ہوسکا ۔

چنانچہ آن کا کلام آج بھی پنجاب یونیورسٹی لاہور کی لائبریری میں خطی نسخوں کی صورت میں موجود ہے - بانکی پور (بھارت) اور برٹش میوزیم لنڈن میں بھی اس کا ایک خطی نسخہ موجود ہے۔ مختصر یہ کہ ملا شاہ لاہوری کا کلام تا دم تحریر چھپ کر سامنے نہیں آیا۔

میں نے اپنے پی ایچ - ڈی - کے فارسی مقالے بعنوان ''تاریخِ شعرِ فارسی در لاہور'' کی تحقیق کے زمانے میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور میں ملا شاہ لاہوری کے کلام کی تمام ضخیم تصانیف کا، جو مثنویات اور دواوین پر مشتمل ہیں، مطالعہ کیا تھا - میں نے ایک بسیط مقالہ بعنوان ''احوال و اشعار ملا شاہ لاہوری'' مذکورہ پی ایچ - ڈی - کے مقالے میں شامل کیا تھا - میرا مذکورہ مقالہ نیشنل پبلشنگ ہاؤس کراچی نے اکتوبر ۱۹۷۱ع میں شائع کیا تھا -

البتہ حال ہی میں میری ایک شاگرد لیکچرار فارسی کوئین میری کالج لاہور عزیزی زمرد سلمان نے ''مثنویات ملا شاہ'' کے عنوان سے فارسی میں پی ایچ - ڈی کا مقالہ پنجاب یونیورسٹی لاہور میں پیش کیا ہے - اب اس موضوع پر تحقیق شروع ہو چکی ہے - مجھے یقین ہے کہ بہت سے نئے پہلو سامنے آئیں گے -

حیرت کی بات یہ ہے کہ جس طرح علامہ اقبال، مولانا روم کے فلسفۂ خودشناسی سے متاثر ہوئے اسی طرح آج سے تین سو برس پہلے شاہجہانی دور کے ملا شاہ لاہوری بھی مولانا روم کے فلسفۂ خود شناسی سے متاثر ہوئے، بلکہ انھوں نے مولانا روم کے زیر اثر ''فلسفۂ نے'' کو اپنے اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے -

اس طرح مولانا روم، ملا شاہ لاہوری اور علامہ اقبال کے افکار کی جو ایک مثلث بنتی ہے، مذکورہ مقالے میں اس پر میں نے ایک تنقیدی بحث کی ہے۔

اس مقالے کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اگر ہم بقولِ علامہ اقبال :

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

آج پھر سے اپنے اسلاف کی میراث کا مطالعہ کر کے اُن کے افکار گراں مایہ کو منظرِ عام پر لائیں تو یقیناً ہم اپنے اقدارِ عالیہ کو پھر سے حاصل کر سکتے ہیں۔

۴۔ علامہ اقبال اور سلطان باھو کے کلام میں 'ھو کی علامت :

کتاب ہذا کا چوتھا مقالہ بعنوان ''علامہ اقبال اور سلطان باھو کے کلام میں 'ھو کی علامت'' ہے۔ اس میں علامہ اقبال اور سلطان باھوؒ نے جس طرح ''ھو'' کی علامت کو استعمال کیا ہے اس پر دونوں شعرا کے اشعار کے حوالے دے کر بحث کی گئی ہے۔

۵۔ اقبال اور پاکستانی نوجوان :

پانچواں مقالہ، جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، ''اقبال اور پاکستانی نوجوان'' کے زیرِ عنوان ہے۔ یہ مقالہ خاص طور پر پاکستان کی نئی نسل کے لیے علامہ اقبال کے پیغامات پر مبنی ہے جس میں

''نظریہ پاکستان'' اور اتحادِ عالم اسلامی کے افکار کی روشنی میں پاکستانی نوجوان کو ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کے لیے بحث کی گئی ہے۔ یہ مقالہ اُن کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔

۶۔ اقبال اور گورنمنٹ کالج لاہور اور علامہ اقبال یونیورسٹی :

چھٹا مقالہ ''اقبال، گورنمنٹ کالج اور علامہ اقبال یونیورسٹی'' کے عنوان سے تحریر کیا گیا ہے۔ یہ علامہ اقبال کے گورنمنٹ کالج لاہور سے درسی، علمی اور ادبی روابط پر مبنی ایک تاریخی مقالہ ہے۔ علاوہ ازیں اس میں وہ تاریخی حوالے اور عینی شواہد بھی شامل ہیں کہ کس طرح ''علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی'' کا قیام گورنمنٹ کالج لاہور میں نکل کر حکومتِ پاکستان کے مرکز اسلام آباد تک جا پہنچا۔ یہ مقالہ گورنمنٹ کالج سے متعلق علامہ اقبال کی تعلیمی اور تدریسی زندگی پر مبنی طلبا و طالبات کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

۷۔ اقبال ایران کی نظر میں :

ساتواں مقالہ ''اقبال ایران کی نظر میں'' کے زیر عنوان ہے جس میں اس امر پر بحث کی گئی ہے کہ اقبال کے فارسی کلام نے نہ صرف پاکستان بلکہ اس برصغیر پاک و ہند سے نکل کر تمام مشرقِ وسطیٰ میں اتحادِ عالم اسلامی کے جذبے کو اس طرح گرما ڈالا کہ عرب ممالک میں بالعموم اور ایران میں بالخصوص دانشور، مفکر اور نامور فارسی شعرا علامہ اقبال کی شاعری کے فنی اور معنوی محاسن کے قائل نظر آتے ہیں۔ بلکہ یہاں تک کہ آقای داود شیرازی جدید فارسی ادب کی تاریخ میں علامہ اقبال کے کلام کو ''سبکِ اقبال'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اسی طرح ملک الشعرا بہار، کاظم رجوی، مجتبیٰ مینوی اور بالخصوص آقای صادق سرمد شاعرِ ملیِ ایران سب

اقبال کے کلام کے مداح ہیں۔ آقای صادق سرمد کو تو عاشقِ اقبال کا نام دیا جانا چاہیے جنھوں نے اقبال کی مدح کرتے ہوئے انھیں اس طرح خراج تحسین عطا کیا ہے:

اگرچہ مرد بمیرد بگردشِ مہ و سال
نمردہ است و نمیرد محمدِ اقبال

اس مقالے میں ایران کے مختلف دانشورں اور شاعروں کے حوالے دے کر مذکورہ موضوع پر بحث کی گئی ہے۔ یہ مقالہ بھی تفہیمِ اقبال کے سلسلے میں ممد و معاون ثابت ہوگا، بالخصوص کلام اقبال کا اثر جس طرح اسلامی ممالک پر پڑا اور وہاں کے دانشور اور سخنور متاثر ہوئے، اس پر بحث کی گئی ہے۔

۸- اقبال اور صادق سرمد شاعرِ ملیِ ایران:

آٹھواں مقالہ "اقبال اور صادق سرمد شاعرِ ملیِ ایران" کے زیرِ عنوان ہے جس میں شاعرِ ملی ایران صادق سرمد مرحوم کے ساتھ راقم حروف کی ذاتی ملاقاتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ جس شدت سے وہ علامہ اقبال کے معتقد تھے اُس کے متعلق میں نے خود ان کے ارشادات سُنے اور قلمبند کیے۔ علاوہ ازیں انھوں نے ذاتی طور پر مجھے ایک مجلہ بعنوان "درایِ کاروان" بھی عطا کیا، جس میں علامہ اقبال اور وجودِ پاکستان پر معرکۃ الآرا قصائد لکھے گئے ہیں۔ ان میں علامہ اقبال، قائداعظم، وجودِ پاکستان اور اہل پاکستان سے متعلق تاریخی اشعار لکھے گئے ہیں۔ علامہ اقبال کے متعلق تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر اقبال جیسا سخن سرا نہ ہوتا تو آج لشکرِ پاکستان کے سرود استقلال کا نغمہ بھی بلند نہ ہوتا۔ اس کا

اظہار صادق سرمد شاعرِ ملیِ ایران نے یوں کیا ہے :

سخن سرائیِ اقبال اگر نبود ، نبود
نوایِ لشکریانِ سُرودِ استقلال

لہٰذا یہ مقالہ علامہ اقبال کے کلام سے متاثر ہونے والے صادق سرمد شاعرِ ملیِ ایران کے افکار پر مبنی ہے اور ایران اور پاکستان کے درمیان جذبۂ اتحادِ ملی اسلام کا پیغام ہونے کے علاوہ اہلِ پاکستان اور ایران کے درمیان دوستانہ اور برادرانہ محبت کے پُرخلوص جذبات کا حامل بھی ہے ، جو بالخصوص آنے والے دور میں نوجوان مسلم نسل کو ''اتحادِ ملت اسلامیہ'' کی راہ میں انھیں ایک قدم آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوگا۔

۹- اقبال اور اتحادِ عالمِ اسلامی :

نواں مقالہ بعنوان ''اقبال اور اتحادِ عالمِ اسلامی'' وقت کے تقاضے کے مطابق نہایت اہم ہے ، جو اہلِ پاکستان کے لیے بالعموم اور مسلمان نسل کے لیے بالخصوص قابلِ غور ہے۔ اس مقالے میں علامہ اقبال کے کلام کے حوالوں سے ہی مدلل بحث کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں علامہ اقبال کے اُن اشعار کو بھی درج کیا گیا ہے جن میں مفکرِ اسلام علامہ اقبال کی پیش گوئیاں موجود ہیں اور جو آئندہ دور میں انشاء اللہ العزیز حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوں گی۔ اس اعتبار سے یہ مقالہ نہ صرف اہلِ پاکستان بلکہ آنے والی تمام اسلامی نژادِ نو کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔

۱۰- اسلامی بلاک اقبال کی نظر میں :

اس کتاب کا دسواں اور آخری مقالہ بعنوان ''اسلامی بلاک

اقبال کی نظر میں'' اقبال اکیڈیمی لاہور نے مجلہ ''اقبال ریویو'' کے شمارہ جولائی ۱۹۸۱ء میں شائع کیا تھا۔ اقبال کی تفہیم کے سلسلے میں یہ مقالہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس مقالے میں علامہ اقبال کو انھی کے کلام کے حوالوں سے مفکرِ اسلامِ عصرِ حاضر کی حیثیت سے نہ صرف خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے بلکہ دلائل دے کر یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ آج ملت اسلامیہ کو جو چاروں طرف سے مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اس کا واحد حل بقولِ علامہ اقبال یہ ہے کہ اقدارِ اسلامی کو قرآن اور سنت کی روشنی میں پھر سے حاصل کر کے ان پر عمل کیا جائے۔ علامہ اقبال نے اس کا اظہار جذباتِ عشقِ مجدی میں ڈوب کر یوں کیا ہے:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

پھر آخری پیغام یوں بھی دیا ہے:

مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

نقطۂ نظر:

میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کی تفہیم کے سلسلے میں یہ کتاب نہ صرف اہل پاکستان کے لیے بلکہ عالم اسلام کے لیے اور مسلم نوجوان نسل کے لیے بالخصوص علامہ اقبال کے افکار کو سمجھنے میں ممد و معاون ثابت ہوگی۔ وہ دن دور نہیں جب کہ دنیا کے تمام مسلمان اتحادِ ملیِ اسلام کے جذبے سے سرشار ہو کر ''اسلامی بلاک'' کی صورت میں ایک ایسی عظیم طاقت بن جائیں گے جو دوسری چھوٹی طاقتوں

کو کچلنے کی بجائے توفیق الٰہی کی بدولت نہ صرف اُن کی مدد کریں گے بلکہ اُن کی رہنمائی اور امامت کرکے مفکر اسلام حکیم ملت علامہ اقبال کے اس پیغام کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے کہ:

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اظہارِ تشکّر:

صدر شعبۂ اقبالیات، جامعۂ پنجاب لاہور، جناب پروفیسر محمد منور صاحب کے ساتھ مجھے گورنمنٹ کالج لاہور میں تقریباً اٹھارہ برس ہم کار ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ ذہانت اور قابلیت کے علاوہ اُن کے خلوص، محبت اور شخصی کردار نے مجھے اتنا گرویدہ بنا لیا کہ آج میں اُن کے حلقۂ احباب میں، اُن کے ہم فکر اور ہم دل دوستوں میں شامل ہو کر فخر محسوس کرتا ہوں۔ جب میں اس کتاب کا مسودہ لے کر اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے اس پر مقدمہ لکھنا بصد شوق قبول فرمایا جس کی وجہ سے میری اتنی حوصلہ فزائی ہوئی کہ مجھے اس کی اشاعت کی تشویق پیدا ہوئی۔ میں سمجھتا ہوں یہ اُنھی کی محبت اور خلوص کا نتیجہ ہے کہ آج میں مسلم نوجوان نسل کے لیے یہ کتاب پیش کر رہا ہوں۔ میں اُن کا تہِ دل سے ممنون ہوں۔

مجھے جناب ڈاکٹر وحید قریشی صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے اس کتاب کا ''پیش لفظ'' لکھ کر ممنون فرمایا۔

آخر میں ڈائریکٹر مجلس ترقی ادب اور اعزازی سیکرٹری بزم اقبال لاہور محترم جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کا شکریہ ادا کیے بغیر

بھی نہیں رہ سکتا جنھوں نے نہ صرف اس کتاب کی اشاعت میں ناچیز کی رہنمائی کی بلکہ اس کا فلیپ (اضافیہ) لکھ کر اس کتاب کی فکری اہمیت میں اضافہ بھی فرمایا : گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

۱۴ - اگست ۱۹۸۴ء ڈاکٹر آغا یمین

صدر شعبۂ فارسی ، گورنمنٹ کالج لاہور

۱

علامہ اقبال اور احترامِ آدمیت

اگر علامہ اقبال کی اردو اور فارسی شاعری کا مجموعی طور پر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ عہدِ طفلی سے لے کر دانائے راز کے مقام پر پہنچنے تک ہمیں اقبال کے کلام میں ایک تدریجی فکری ارتقاء نظر آتا ہے جس کی معراج احترامِ آدمیت ہے۔

اقبال کا تدریجی فکری ارتقاء :

میری نظر میں اقبال کے فکری اور تدریجی ارتقا کے چار مدارج ہیں ؛ پہلا درجہ اقبال کا ابتدائی دور ہے ، دوسرا درجہ اقبال کی حب الوطنی کا دور ، تیسرا درجہ اقبال کے فکرِ ملی کا دور اور چوتھا درجہ اقبال کے فکری معراج کا دور ہے ، جو اس کے فلسفہ احترامِ آدمیت پر مشتمل ہے۔

فکرِ اقبال کا ابتدائی دور :

یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ شعر گوئی کا ملکہ ہر ایک انسان کے بس کا روگ نہیں بلکہ یہ طبع سلیم ، خالقِ کل کی طرف سے اس شخص کو عطا کی جاتی ہے جسے خدا چاہے ، لہذا اس اعتبار سے یہ طبع سلیم اختیاری نہیں بلکہ فطری ہے۔ اقبال کو بھی خدا نے ایک ایسی طبع سلیم عطا کی تھی جس کی بدولت انھوں نے ابتدائی دور سے ہی ایسے شعر کہنا شروع کر دیے تھے کہ ان سے اقبال کے طبع زاد شاعر ہونے کی دلیل ملتی ہے۔

اگر اقبال کے ابتدائی دور کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں ان کی ابتدائی نظمیں مثلاً "ایک گائے اور بکری" یا "پرندے کی فریاد" وغیرہ، ان کے ابتدائی ذہنی شعور کا عکس دکھائی دیتی ہیں ۔ ان نظموں میں بھی ان کا فکر بیداری، غیر شعوری طور پر آنے والے فکری ارتقاء کا پیش خیمہ تھا، مثلاً ہالنگ درا میں "پرندے کی فریاد" کی نظم کا یہ آخری شعر ملاحظہ ہو:

آزاد مجھ کو کردے او قید کرنے والے
میں بےزباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے[1]

مندرجہ بالا شعر میں علامہ اقبال نے جو غیر شعوری طور پر آرزو کی تھی، آج ہم دیکھتے ہیں کہ وہ پوری ہو چکی ہے اور اب ان کا ملک آزاد ہے، لہذا ان کے اس شعر کو آنے والے دور کا پیش خیمہ قرار دیا جا سکتا ہے ۔ لیکن شعر گوئی کے اعتبار سے یہ اقبال کے فکر کا ابتدائی دور ہے ۔

اقبال کی حب الوطنی :

جب علامہ اقبال یورپ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد واپس آئے تو ان کی نگاہ اپنے اہل وطن کی حالت زار پر پڑی جو کہ فرنگی شاہنشاہیت کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے —— در حقیقت اقبال ایک درد بھرا دل رکھتے تھے، اس لیے ان کا دل اپنے اہل وطن کے لیے بے تاب ہو گیا، جس کا اظہار انھوں نے اپنی مشہور نظم "تصویرِ درد" میں یوں کیا ہے:

رلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں[2]

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

یہاں سے ہی ان کی حب الوطن شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ بعض نقادوں کے نزدیک علامہ اقبال کی شاعری وطن پرستی کی عکاسی کرتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اسے وطن پرستی سے تعبیر کرنا مناسب نہیں۔ اگر مندرجہ بالا اشعار کا تنقیدی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا پیغام وطن کو پوجنے یا وطن پرستی کی قطعاً دعوت نہیں دیتا بلکہ وطن کو آزاد کروانے کی فکر کی دعوت دیتا ہے، اور یہی اقبال کی حب الوطنی کی روشن دلیل ہے۔ یہاں اقبال کی دور بین نگاہ نے اہلِ وطن کو آنے والی مصیبت سے آگاہ کر کے انھیں بیدار کیا ہے۔ لہٰذا ہم اقبال کو ایک وطن پرست نہیں بلکہ محب وطن شاعر کہہ سکتے ہیں۔

اقبال کا فکرِ ملّی :

علامہ اقبال کے نقطۂ نظر سے حب الوطنی کو بے شک اہمیت حاصل ہے، لیکن وطن پرستی ان کا عقیدہ نہ تھا، جس کی دلیل ہمیں خود علامہ اقبال کے اُس صدارتی خطبے سے ملتی ہے جو انھوں نے ۱۹۳۲ء میں ''آل انڈیا مسلم کانفرنس'' کے سالانہ اجلاس لاہور میں دیا تھا۔ اس خطبے کے مندرجہ ذیل الفاظ ملاحظہ ہوں :

''حبِ وطن کا یہ ایک فطری وصف ہے جس کا انسان کی اخلاقی زندگی میں ایک مقام ہے، لیکن جس چیز کو اصل اہمیت حاصل

ہے وہ ہے انسان کا عقیدہ ، اس کی ثقافت اور اس کی تاریخی روایت ۔ میری رائے میں یہ وہ اقدار ہیں جن کے لیے انسان کا جینا اور مرنا وقف ہو سکتا ہے ، نہ کہ اس خطۂ خاک کی خاطر جس کے ساتھ اس کی روح اتفاقاً ، عارضی طور پر وابستہ ہو گئی ہو ۔"[۳]

علامہ اقبال کے تدریجی فکری ارتقاء میں یہی وہ نقطۂ معطوف ہے ، جس کی بدولت آپ نے وطنی شاعری کی منازل طے کرنے کے بعد قومی شاعری کی طرف رجوع کیا ، جس کی سرحدات اس بر صغیر پاک و ہند کو عبور کر کے نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر پہنچ چکی تھیں ۔ اب ان کا تدریجی فکر ، ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے اس مقام تک آ پہنچا تھا جہاں انھیں کسی بھی افغانی ، ترکی ، تتاری یا عجمی میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیتا تھا ، بلکہ وہ سب کے سب چمنِ اسلام کے گل بوٹے دکھائی دے رہے تھے جو شجرِ اسلام کی ایک شاخ سے منسلک تھے ، جہاں ان کے عقیدے کے مطابق تمیزِ رنگ و بو حرام تھی اور وہ سب رنگ و نسل میں مختلف ہونے کے باوجود دینِ اسلام کی وحدت کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے ۔ ان جذبات کا اظہار علامہ اقبال نے نہایت شد و مد سے "پیام مشرق" میں "لالۂ طور" کے عنوان سے مندرجہ ذیل قطعے میں یوں کیا ہے :

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم[۴]

جب اقبال کی نگاہ افغانستان ، ایران ، ترکیہ سے ہوتی ہوئی عربستان پر پڑی تو اس دور کا عربی مسلمان ، عربی النسل ہونے پر

ناز کرتا ہوا دکھائی دیا چنانچہ اقبال نے اسی سر زمینِ عرب میں ، اس خالقِ کل کی طرف سے بھیجے ہوئے پیغمبر آخر الزمان ، رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خطبہ حجۃ الوداع کی طرف اشارہ کیا ، جس میں خدا کے آخری رسول ؐ نے تمام آنے والی نسلوں کے نام بلا امتیازِ رنگ و خون آپس میں بھائی بھائی ہونے کا پیغام دیا تھا ۔ لہذا اقبال نے "پیامِ مشرق" میں "لالہ طور" کے ایک اور قطعے میں اس کا اظہار یوں کیا ہے :

تو ای کودک منش خود را ادب کن
مسلمان زادہ ای ترکِ نسب کن
برنگِ احمر و خون و رگ و پوست
عرب نازد اگر ترکِ عرب کن ہ

ردِ مغرب اور اہلِ مشرق :

جب فکری ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے اقبال کا فکر ، جاوید نامہ" میں اجرامِ فلکی کی سیر کرتا ہے اور فلکِ عطارد میں نچ کر جمال الدین افغانی کی روح سے ہم کلام ہوتا ہے تو روحِ نانی ، — "لردِ مغرب" یعنی مغربی لارڈزم یا مغربی جاگیر داری مکر و فن سے تعبیر کرتی ہے اور اہلِ مشرق کو مغربیت اس مکر و فن سے آگاہ کرتے ہوئے بتاتی ہے کہ تم تو آپس میں شام و فلسطین و عراق کی حد بندیوں میں الجھ رہے ہو ۔ ادھر مغرب اپنا مرکز قائم کرنے کی فکر میں ہیں ۔ اس کا اظہار مہ اقبال نے "جاوید نامہ" میں روحِ افغانی کی زبان سے یوں ہے :

گردِ مغرب ، آن سراپا مکر و فن
اہلِ دیں را داد تعلیمِ وطن

او بفکرِ مرکز و تو در نفاق
بگزر از شام و فلسطین و عراق[۶]

آخری منزل احترامِ آدمیت :

اقبال کے فکر کی یہ وہ تدریجی منزل ہے جہاں اقبال اہلِ مشرق کو اہلِ مغرب کے مکر و فن کے چنگل میں جکڑا ہوا دیکھتے ہیں تو انھیں وہ ماحول ، احترامِ آدمیت سے خالی محسوس ہوتا ہے ۔ یہاں روح افغانی اقبال کی رہنمائی کرتے ہوئے کہتی ہے کہ اگرچہ آفتاب اپنی پوری تجلی اور آب و تاب کے ساتھ مشرق سے نکلتا ہے لیکن اس میں وہ آب و تاب اور چمک دمک کہاں سے آئی ؟

آفتاب ، مشرق سے اپنا جلوہ اس لیے دکھاتا ہے تاکہ وہ تمام جہان کو منور کر سکے ۔ اگرچہ وہ مشرق کی نسبت سے خاوری یعنی مشرقی ہے لیکن اس کی فطرت مشرق و مغرب کے تفاوت سے بری ہے ۔ اس کا اظہار اقبال نے روحِ افغانی کی صورت میں یوں کیا ہے :

گرچہ از مشرق بر آید آفتاب
با تجلی ہای شوخ و بی حجاب
در تب و تاب است از سوز درون
تا ز قید شرق و غرب آید برون
بر دمد از مشرق خود جلوہ مست
تا ہمہ آفاق را آرد بدست

فطرتش از مشرق و مغرب بری است
گرچہ او از روی نسبت خاوری است

یہاں فطرتِ مشرق سے مراد وہ مشرقی فطرت ہے جسے انھوں نے آفتاب کے سمبل (Symbol) یا علامت میں پیش کیا ہے اور یہاں آفتاب عشق کا سمبل بنتا ہے یعنی جس طرح آفتاب خود جلتا ہے اور وہ خود جل کر اپنی روشنی ، مشرق و مغرب میں پھیلاتا ہے جس سے تمام دنیا منور ہو جاتی ہے ، اسی طرح انسان کے جسدِ خاکی میں دل ایک ایسا آفتاب ہے جو عشق کی روشنی سے اپنے آپ کو جلا کر دوسروں کے دلوں میں عشق کی روشنی ڈالتا ہے ، تو پھر انسان یقیناً اپنی آخری منزل یعنی احترام آدمیت کے مقام تک پہنچ جاتا ہے - یہ انسان کا دل ہی ہے جو اسے احترامِ آدمیت کے عروج تک لے جاتا ہے - یہ دل ہی ہے جو دوسروں کے دلوں پر قبضہ کرتا ہے - اقبال کے نزدیک دل کی سلطنت کو حاصل کرنا ہی ابن آدم کی معراج ہے- اور دل کی سلطنت پر اس وقت تک قبضہ نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ انسان سرِ عشق سے آگاہ نہ ہو -

اقبال کے نزدیک عشق ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے توسل سے انسان اپنی معراج انسانیت کو پہنچ سکتا ہے - اور یہ اُس وقت ممکن ہے جب انسان اس خالقِ کل کی تمام مخلوقات اور کائنات میں خود اپنے خالقِ کل کا عکس دیکھ سکے - پھر اسے یقیناً تمام کائنات سر تا پا محبوب حقیقی بن کر دکھائی دے گی اور وہ تمام مخلوقات اور کائنات سے پیار کرنے لگے گا اور انسان کا احترام انسان

ہونے کی حیثیت سے کرے گا - یہی وہ نائب خدا یعنی ''خلافت الٰہیہ'' کا مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے -

یہی وجہ ہے کہ اقبال نے ابنِ آدم کو سرِ عشق سے تعبیر کیا ہے ، جس کے آثار عالمِ سفلی و علوی یعنی دونوں جہان کی کائنات میں پھیلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں - اُن میں ابن آدم یعنی انسان بذات خود سرِ عشق ہے ، اور عشق سام و حام کی نسلی اور روم و شام کی ملکی حدود سے آزاد اور ماورا ہے - اس کا اظہار علامہ اقبال نے ''جاوید نامہ'' میں ''خلافتِ آدم'' کے عنوان سے یوں کیا ہے :

در دو عالم ، ہر کجا ، آثارِ عشق
ابنِ آدم ، سرّی از اسرارِ عشق
سرِّ عشق ، از عالمِ ارحام نیست
او زِ سام و حام و روم و شام نیست[۸]

احترامِ آدمیت کی منزل وہی عشق کی منزل ہے جہاں نہ تو کسی نسل و حسب ، کالے گورے ، نیچے اونچے کا امتیاز ہوتا ہے اور نہ ہی ملک و ملت کی حدود اسے محدود کر سکتی ہیں ، بلکہ انسان تمام حدود کی بندشیں توڑ کر انسانیت کی معراج پر دکھائی دیتا ہے - اقبال نے اس کی مثال یوں دی ہے کہ جب عشق انسان کے دل کے اندر آہستہ آہستہ گھر کر لیتا ہے تو پھر عشق غیب سے حضور میں آتا ہے - اس وقت اس کی نہ کوئی حد ہوتی ہے اور نہ ہی اس کے ملک کی کوئی سرحد - اسی نظم کا یہ شعر دیکھیے :

خردہ خردہ غیبِ آو ، گردد حضور
نے حدود آو را ، نہ ملکش را ثغور[۹]

پھر انسان اس مقام پر پہنچ جاتا ہے ، جہاں تمام کائنات تو آدم میں گم دکھائی دیتی ہے ، لیکن آدم دنیا میں سما نہیں سکتا ۔ اس نظم کا یہ شعر ملاحظہ ہو :

آنچہ در آدم بگنجد ، عالم است
آنچہ در عالم نگنجد آدم است[۱۰]

اقبال کا عقیدہ ہے کہ جب انسان احترامِ آدمیت کے مقام پر پہنچتا ہے تو اس کی کیفیت آفاقی ہو جاتی ہے ، لہذا تمام عالم تو اس میں گم ہو سکتا ہے ، لیکن اس کی آفاقیت کا میدان اتنا وسیع ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں نہیں سما سکتا اور اس کی منزل گردوں سے بھی ماورا نظر آتی ہے ، اور یہی انسانی تہذیب کی اصل اور احترامِ آدمیت کی معراج ہے ۔

آج ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم علامہ اقبال کے اس ہمہ گیر اور آفاقی فکر یعنی احترام آدمیت کا پیغام ابن آدم کی تمام نسلوں تک پہنچا دیں کہ وہ نسل و حسب ، اونچے نیچے ، کالے گورے اور چھوٹے بڑے کی تمام حدود کو توڑ کر انسان ہونے کی حیثیت میں سب کے سب بھائی بھائی بن جائیں ، اور انفرادی صورت سے لے کر اجتماعی صورت تک کسی کی کوئی دل شکنی نہ کرسکے یہی احترامِ آدمیت کی معراج ہے ۔

میں سمجھتا ہوں کہ علامہ اقبال کی اس نظم کا یہ شعر احترام آدمیت کے فلسفے کی ایک مکمل اور کھلی کتاب ہے ، لہذا وقت چاہتا ہے کہ علامہ اقبال کے فلسفۂ احترامِ آدمیت کا یہ آفاقی پیغام تمام نسلِ آدم کو پہنچا دیا جائے :

برتر از گردون مقامِ آدم است
اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

حوالہ جات :

۱- علامہ اقبال : بانگ درا ، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور ، ص ۲۴ ، ۱۹۷۱ء -

۲- علامہ اقبال : بانگ درا ، ایضاً ، ص ۶۵ - ۶۶ -

۳- خطبہ اقبال ، آل انڈیا مسلم کانفرنس ۱۹۳۲ء ، لاہور -

۴- علامہ اقبال : پیام مشرق ، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور ۱۹۶۹ء ، ص ۵۲ -

۵- پیام مشرق ، ایضاً ، ص ۵۲ -

۶- علامہ اقبال : جاوید نامہ ، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور ۱۹۷۰ء ، ۲۷ -

۷- علامہ اقبال : جاوید نامہ ، ایضاً ، ص ۶۸ - ۶۹ -

۸- علامہ اقبال : جاوید نامہ ، ایضاً ص ۷۵ -

۹- علامہ اقبال : جاوید نامہ ، ایضاً ص ۷۵ -

۱۰- علامہ اقبال : جاوید نامہ ، ایضاً ص ۷۵ -

★ ★ ★

اقبال، مزدور، لینن، کارل مارکس اور سعدی

علامہ اقبال نے تمام انسانی تاریخ میں مزدور کی زندگی کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعرِ مشرق نے مزدور کی مکمل تاریخ چند اشعار میں اس طرح سمو کر رکھ دی ہے جیسے دریا کو کوزے میں بند کر دیا جائے۔ چنانچہ آنھوں نے نہ صرف مشرق کے حکما اور بالغ نظر انسانیت کے رہنماؤں مثلاً امام غزالی، سعدی اور رومی، ٹالسٹائے اور لینن کے افکار کا بغور مطالعہ کیا ہے، بلکہ مغرب کے علما اور مفکرین مثلاً شوپن ہار، نیٹشے، آئن سٹائین، ہیگل، گوئٹے اور کارل مارکس کے افکار کی روشنی میں مزدور کی زندگی کی عکاسی کی ہے۔

لینن اور اقبال:

اس ضمن میں علامہ اقبال نے اپنی مشہور تصنیف "پیامِ مشرق" جو آنھوں نے جرمنی کے مشہور مفکر گوئٹے کے جواب میں لکھی، کی ایک نظم بعنوان "موسیو لینن و قیصر ولیم" میں روس کے جمہوریہ اشتراکیہ کے صدر موسیو لینن کے افکار کی عکاسی اپنے اشعار میں یوں کی ہے:

بسی گذشت کہ آدم درین سرای کہن
مثالِ دانہ تہِ سنگِ آسیا بودست

یعنی کافی عرصے سے انسانی تاریخ میں مزدور جو خود ایک انسان ہے سرمایہ داری کی چکی کے دو پاٹوں کے درمیان دانوں کی مانند ہمیشہ

پستا رہا ہے۔ اور پھر یوں کہا کہ:

فریبِ زاری و افسونِ قیصری خورد ست
اسیرِ حلقۂ دامِ کلیسیا بود ست

یعنی مزدور نے کبھی زارِ روس سے دھوکا کھایا اور کبھی قیصرِ روم کی افسوں گری کا شکار ہوا اور کبھی دامِ کلیسا میں اسیر رہا۔ اس شعر میں زارِ روس اور قیصرِ روم دراصل شہنشاہیت (Imperialism) کی علامت ہیں اور کلیسا بادشاہ گر (king-makers) کی علامت ہے۔ گذشتہ زمانوں میں موبد آتش کدوں میں اور پوپ کلیساؤں میں اتنا اختیار اور طاقت رکھتے تھے کہ وہ شہنشاہیت کو قائم اور دائم رکھنے کے لیے جسے چاہتے بادشاہ بنا دیتے تھے اور اس طرح یہ شہنشاہیت کا نظام ہمیشہ جاری و ساری رہا۔ آخر پھر وہ دور آیا جب اس تشدد پسند شہنشاہیت اور سرمایہ داری کے خلاف شکاگو کے مزدوروں نے علمِ بغاوت بلند کیا۔ لہٰذا ان کے اجتہاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لینن یوں نعرہ لگاتا ہے کہ:

غلامِ گرسنہ دیدی کہ بر درید آخر
قمیصِ خواجہ کہ رنگیں ز خونِ ما بود ست

یعنی کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اس مزدور نے، جو کئی صدیوں سے سرمایہ داری کی چکی کے دو پاٹوں میں دانوں کی طرح پستا چلا آ رہا تھا، سرمایہ داری کا دامن، جو ہمیشہ اس کے خون سے سرخ رہتا تھا، چاک کر کے رکھ دیا؟

آخر میں اس نے یہ کہا:

شرارِ آتشِ جمہور کہنہ سامان سوخت
ردایِ پیرِ کلیسا، قبایِ سلطان سوخت

یعنی آج مزدور اور محنت کش نے جمہورِ کہنہ کو جلا کر راکھ کر ڈالا اور دقیالوسی، تشدد پسند شہنشاہیت کے پرخچے اڑا دیے۔ یہاں ''ردائے پیرِ کلیسا'' (king-makers) اور ''قبائے سلطان'' شہنشاہیت کی علامت ہیں۔

''لینن (خدا کے حضور میں)''

اقبال عصرِ حاضر کے مشینی دور سے، جس میں احساسِ مروّت کو کچلا جا رہا ہے، متنفر ہو کر چلا اٹھتے ہیں اور ''بالِ جبریل'' کی مشہور نظم بعنوان ''لینن (خدا کے حضور میں)'' میں اپنے انھی احساسات کا یوں اظہار کرتے ہیں:

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروّت کو کچل دیتے ہیں آلات!

پھر لینن کی زبان بن کر خدا کے حضور یوں گلہ کرتے ہیں:

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات!

لینن انسان ہونے کی حیثیت سے سرمایہ دار اور مزدور کو انسانیت کی ایک ہی صف میں کھڑا دیکھنا چاہتا ہے، اس لیے وہ ابھی تک دنیا میں اس روزِ مکافات کا منتظر ہے جب سرمایہ پرستی کا سفینہ ڈوب جائے گا اور بندۂ مزدور کے اوقات تلخ نہیں رہیں گے، اور دنیا میں سلطانیٔ جمہور کا زمانہ آئے گا۔

فرمانِ خدا: اقبال ''بالِ جبریل'' میں اپنی ایک اور مشہور نظم

''فرمانِ خدا'' میں خدا کی زبان بن کر فرشتوں سے خطاب کرتے ہوئے اس کا جواب یوں دیتے ہیں:

اٹھو، مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے، مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

علامہ اقبال کی اس مشہور نظم کو اگر ایک الہامی نظم کہا جائے تو میرے نزدیک یقیناً درست ہوگا۔ اس نظم کا انداز بیان اور طرزِ نگارش اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ افکار یقیناً الہامی ہیں۔ اقبال نے اپنے من میں ڈوب کر ان کا سراغ لگایا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ اقبال کو حکم ہوا ہے کہ وہ آنے والی نسلوں کو خدا کا یہ پیغام پہنچا دے کہ اب وہ وقت آ رہا ہے جب مزدور، محنت کش اور غریب عوام خوابِ غفلت سے ضرور بیدار ہوں گے اور کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا کر رکھ دیں گے، اور سالہا سال سے کچلا ہوا مزدور جو آج ایک کمزور چڑیا کی مانند ہے تشدد پسند سرمایہ دار کے شاہین سے ٹکرا جائے گا۔ اب نقشِ کہن سب مٹ جائیں گے اور سلطانیٔ جمہور کا زمانہ آئے گا۔ وہ کھیت سب جلا کر راکھ کر دیے جائیں گے جن سے دہقان کو روزی میسر نہ ہوتی ہو۔

علامہ اقبال کی یہ نظم ''فرمانِ خدا'' ایک پیش گوئی ہے جو

آج کے اس جمہوری دور میں پوری ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔ اقبال کی یہ نظم پیش گوئی کے علاوہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک پیغامِ عمل بھی ہے۔ بالفاظِ دیگر "اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو" کا محض زبانی نعرہ لگانے سے ہی بات نہیں بنتی بلکہ اس پر عمل پیرا ہو کر اجتہاد ضروری ہے۔ اور کسی کام کے اجتہاد و عمل کے لیے سب سے پہلے انسان کے شعور کو بیدار کرنا ازبس ضروری ہے۔ جب تک شعور بیدار نہ ہوگا، احساس بھی پیدا نہ ہو سکے گا، لیکن جب شعور بیدار ہوگا تو احساس بھی پیدا ہوگا اور جب احساس پیدا ہوگا تو اس سے اگلی منزل عمل و اجتہاد کی ہے۔ یہاں اقبال نے کارل مارکس کے نظریے کو ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔

کارل مارکس اور اقبال:

بقولِ علامہ اقبال[1] "کارل مارکس ـــ جرمنی کا مشہور اسرائیلی ماہرِ اقتصادیات ـ جس نے سرمایہ داری کے خلاف قلمی جہاد کیا، اس کی مشہور کتاب موسوم بہ 'سرمایہ' [*Des Kapital*] کو مذہبِ اشتراکی کی بائبل تصور کرنا چاہیے۔" اس میں اقبال نے اپنی مشہور نظم بعنوان "صحبتِ رفتگاں" میں کارل مارکس کی زبان سے انسان کو اپنی ہستی سے باخبر ہونے کے لیے شعور اور احساس دلاتے ہوئے یوں فرمایا ہے:

رازدانِ جزو و کل از خویش نا محرم شد است
آدم از سرمایہ داری قاتلِ آدم شد است[1]

۱۔ علامہ اقبال: "پیامِ مشرق" (لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۶۹ء، طبع دوازدہم)، ص ۲۳۶۔

کارل مارکس نے یہ احساس محض مزدور کو ہی نہیں دلایا بلکہ اس نے انسان کے دونوں طبقوں، مزدور اور سرمایہ دار، کو اپنی ہستی سے باخبر ہونے کی دعوت دی ہے، اور دونوں کو جزو و کل کی ایک اکائی قرار دے کر انسانیت کی معراج حاصل کرنے کے لیے کہا ہے۔ اس نے سرمایہ دار کو جس نے مشینوں کے آلات میں گم ہو کر اپنے احساسِ مروّت کو کچل ڈالا ہے، مزدور سے ہمدردی اور مروّت سے پیش آنے کے لیے درس دیا ہے اور اس مزدور کو جو خود اپنی حقیقت سے نا آشنا ہے، ایک عظیم انسان ہونے کا تصوّر دلا کر گرمایا ہے کہ وہ انسانیت کے جزو و کل کا اصل رازداں ہے۔ اسے چاہیے کہ اب وہ اپنی حقیقت سے آشنا ہو کر بے حس اور بے مروّت سرمایہ دار سے اپنا حق چھین لے، اور جمہور کہنہ میں انقلاب لا کر ایک نئے نظام یعنی سلطانیٔ جمہور کی بنیاد ڈالے۔

انقلاب، مزدور اور اقبال:

اقبال نے ''زبورِ عجم'' (ص ۱۴۴) میں کارل مارکس کے اسی فلسفے کے زیرِ اثر اپنی زبان میں مزدور کو سرمایہ داری کے خلاف عَلمِ استحقاق بلند کرنے کے لیے انقلاب کا یوں نعرہ لگایا ہے:

خواجہ از خونِ رگِ مزدور، سازد لعلِ ناب
از جفایِ دہ خدایانِ کشتِ دہقانان خراب
انقلاب! انقلاب! ای انقلاب!

یعنی سرمایہ دار، مزدور کا خون چوس کر اپنے لیے لعلِ ناب تیار کرتا ہے۔ یہاں اقبال لعلِ ناب کو سرمایہ دار کی عیش و عشرت کی علامت قرار دیتے ہیں۔ دوسری مثال یوں دی ہے کہ کسان اور مزدور

تمام سال اپنے خون پسینے کو ایک کر کے دھرتی کے سینے سے غلہ نکالتا ہے اور جب مزدور کسان کا ثمرہ خرمن گاہ میں منظرِ عام پر آتا ہے تو جفا کار دہ خدا ، یعنی زمین کا مالک ، جس نے قطعاً کوئی محنت نہیں کی ہوتی ، کسان مزدور کی محنت کا یہ پھل سب کا سب دست تشدد سے چھین کر لے جاتا ہے۔ وہ انسان جس نے خود اپنے ہاتھوں یہ غلہ پیدا کیا ہوتا ہے اسے روٹی تک کھانے کو نصیب نہیں ہوتی ، لٰہذا انسانی تاریخ میں ایسے جفا کار دہ خداؤں کے خلاف اقبال مزدور کو گرماتے ہوئے انقلاب کا تین بار یوں شدید نعرہ لگاتا ہے کہ :

"انقلاب ! انقلاب ! ای انقلاب !"

درس انسانیت ــ سعدی اور اقبال :

اس میں شک نہیں کہ اقبال لینن اور کارل مارکس کی ان اجتہادی کوششوں کو سراہتے ہیں ، لیکن جب لینن کو خدا کے حضور میں انتہائی حسرت و یاس سے یہ گلہ کرتے ہوئے سُنا :

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ ؟
دنیا ہے تری منتظرِ روزِ مکافات

تو اطمینانِ قلب نصیب نہ ہوا ۔ لٰہذا وہ اس کا حل تلاش کرنے کے لیے خدا کے حضور حاضر ہو کر "فرمانِ خدا" کی آواز بن جاتے ہیں اور پھر غریبوں کو جگانے اور کاخِ امرا کے در و دیوار ہلانے کی دعوت دیتے ہیں ۔ جب محض نعرہ لگانے سے بھی کوئی بات نہیں بنتی تو پھر لینن اور کارل مارکس سے ہٹ کر اُن کی نگاہ اسی مشرقی زمین کی نشاۃ ثانیہ پر پڑتی ہے اور انھیں شیخ سعدیؒ کی "گلستان" میں

فلسفۂ حیات کا حل یوں روشن دکھائی دیتا ہے :

بنی آدم اعضای یک دیگراند کہ در آفرینش ز یک جوہراند
چو عضوی بدرد آورد روزگار دگر عضوہا را نمانند قرار
توکز محنتِ دیگران بی غمی نشاید کہ نامت نہند آدمی

یعنی حضرت آدم کی اولاد خواہ وہ سرمایہ دار ہو یا کار گر ، وہ عالم ہو یا جاہل وہ امیر ہو یا غریب ، وہ مزدور یا محنت کش ہو یا آقا یا فرماں روا ، طبیعی اعتبار سے سب انسان کے جسم کے اعضا کی مانند ایک دوسرے سے جزوِ لاینفک کی طرح منسلک ہیں ۔ مثلاً جب کبھی جسم کے ان اعضا میں سے کسی ایک عضو کو تکلیف پہنچتی ہے تو فطری اعتبار سے جسم کے دوسرے تمام اعضا کو بھی چین اور قرار نصیب نہیں ہوتا ۔ لہٰذا اے انسان ! تجھے بھی اسی طرح ہر ایک انسان کی تکلیف اور درد کا احساس ہونا چاہیے اور تجھے دوسرے انسان کا درد اپنے ہی درد کی طرح محسوس ہونا چاہیے ۔ اور اگر تو ایسا محسوس نہیں کرتا تو پھر یقیناً تو آدمی کہلانے کا مستحق نہیں ہے اور نہیں چاہیے کہ تجھے انسان کہہ کر پکارا جائے ۔ لہٰذا اقبال نے شیخ سعدی کے پہلے مصرعے کو ''پیامِ مشرق'' میں ایک نظم بہ عنوان ''محاورہ مابین حکیم فرنسوی اگسٹس کومٹ و مردِ مزدور'' میں یوں تضمین کیا ہے :

''بنی آدم اعضای یک دیگراند'' بہاں نخل را ، شاخ وبرگ وبراند

مندرجہ بالا دوسرے مصرعے میں اقبال نے سعدی کے اس فلسفۂ انسانیت کی تشریح کرتے ہوئے بنی آدم کو ایک درخت سے تعبیر کیا ہے اور یہ کہ اس کے تمام برگ و بر یعنی شاخیں ، پتے ، پھول اور

پھل سب ایک اکائی ہیں اور فطری طور پر یہ سب ایک درخت کے اجزا ہیں اور ان تمام اجزا سے مل کر درخت ایک 'کل کی صورت اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح انسان پہلے انفرادی حیثیت میں ایک جزو ہے اور پھر اجتماعی حیثیت میں ان تمام اجزا کا مرکب بن کر ایک 'کل کی صورت یعنی قوم کی شکل میں دکھائی دیتا ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے انھی افراد کے ربط سے مل کر ایک قوم بنتی ہے۔

اسی فلسفۂ ربطِ ملت کو اقبال نے ''بانگِ درا'' میں اپنی مشہور نظم ''شمع اور شاعر'' کے اس شعر میں یوں پیش کیا ہے:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اقبال کے مندرجہ بالا افکار اور شواہد و دلائل سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اقبال جب انسانی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے سرمایہ داری اور زر پرستی کے چنگل میں کسان، محنت کش یا ایک مزدور کو کچلتے ہوئے دیکھتے ہیں، تو انھیں ویسے ہی دکھ ہوتا جس طرح یہ ان کا اپنا دکھ ہے۔ لہٰذا وہ ایک شاعر ہونے کی حیثیت سے اپنے آپ کو قوم کی آنکھ محسوس کرتے ہیں اور ''بانگِ درا'' کی اپنی ایک مشہور نظم بہ عنوانِ ''شاعر'' میں اس درد کے احساس کا یوں اظہار کرتے ہیں:

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

مختصر یہ کہ اقبال اس ربطِ ملت کو قائم کرنے کے لیے انسانی زندگی کے سب طبقوں کو مل کر کاروانِ حیات کو آگے چلانے کی

U-109429

دعوت دیتے ہیں۔ اقبال کی نظر میں مزدور، عوام، محنت کش، سرمایہ دار، حاکم و محکوم سب کے سب عظیم انسان ہیں اور ایک دوسرے کے جزوِ لاینفک ہیں، اور انسان کو انسان سمجھنا ہی انسانیت کی معراج ہے۔

وقت کا تقاضا ہے کہ آج ہم شیخ سعدیؒ اور علامہ اقبالؒ کے درسِ انسانیت کے اس پیغام پر عمل پیرا ہو کر ملک و ملت کے ارتقا کی خاطر سب ایک ہو جائیں۔ ہم سب کسان، محنت کش، مزدور، عوام اور حاکم و محکوم سب کے سب ایک جسم و جان بن کر راہِ ترقی پر گام زن ہوں۔ اسی میں پاکستان کے ملک اور قوم کی بھلائی ہے۔

★ ★ ★

۳

اقبال اور مُلاّ شاہ لاہوری

کا فلسفۂ خود شناسی

لاہور پاکستان کا وہ تاریخی شہر ہے جو غزنوی دور سے لے کر آج تک فارسی علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ اس خاکِ پاک میں آج بھی کئی اسلامی فلسفی اور مفکر ابدی نیند سو رہے ہیں۔ ان عارفانِ بزرگ اور سخنورانِ شعرِ فارسی میں سے شاہجہانی دور کے مُلاّ شاہ لاہوری کا نام قابلِ ذکر ہے۔

مُلاّ شاہ لاہوری کے حالاتِ زندگی اُن کے ہم عصر مورخین مُلاّ عبدالحمید لاہوری کے "بادشاہ نامے"، محمد صالح کنبوہ کے "عملِ صالح" اور دارا شکوہ کے "سکینۃ الاولیا" میں بھی ملتے ہیں، لیکن سب سے زیادہ مستند اور مفصل حالات حضرت مُلاّ شاہ لاہوری کی مرید خاص اور شاہجہان کی دخترِ نیک اختر شہزادی جہاں آرا بیگم کی تصنیف "رسالہ صاحبیہ" میں درج ہیں، اور کچھ حالات اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے کے مشہور مصنف شیر خاں لودی کے "تذکرہ مرأۃ الخیال" میں بھی موجود ہیں۔ مابعد کے تذکروں مثلاً نور احمد چشتی کی "تحقیقاتِ چشتی" اور سید محمد لطیف کی انگریزی میں لکھی ہوئی مشہور کتاب *Lahore* میں بھی مندرجہ بالا کتب کو ہی مُلاّ شاہ لاہوری کے حالاتِ زندگی کا ماخذ ٹھہرایا گیا ہے۔

یہاں موضوع کے مطابق مُلاّ شاہ لاہوری کے حالاتِ زندگی کی تفصیلات بیان کرنا مقصود نہیں، بلکہ اس مقالے میں مُلاّ شاہ لاہوری

اور علامہ کے ہم فکر ہونے پر بحث کرنا مقصود ہے تا کہ ہم دیکھ سکیں کہ عصرِ حاضر کے مفکرِ اسلام علامہ اقبال کے فلسفے کے ہم فکر وہ کون سے مفکرین ہیں جو اس خاکِ پاک کے دفینے میں آج گوہر ہائے آبدار کی مانند پوشیدہ ہیں۔

جہاں تک مُلاّ شاہ لاہوری کے حالات کا تعلق ہے وہ میں نے اپنی فارسی تصنیف بعنوان "تاریخِ شعرِ فارسی در لاہور" میں تفصیلاً تحریر کر دیے ہیں جو اکتوبر ۱۹۷۱ء میں کراچی سے شائع ہوئی تھی۔ البتہ یہاں اتنا واضح کر دینا لازم ہوگا کہ حضرت مُلاّ شاہ بدخشان میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی، تمام دینی اور دنیوی علوم حاصل کرنے کے بعد سیاحت شروع کی۔

شیر خاں لودی[1] کے بیان کے مطابق مُلاّ شاہ لاہوری پہلے کابل تشریف لائے اور وہاں سے ایک تاجر کے ساتھ ہندوستان میں حضرت میاں میرک، جو آج حضرت میاں میر کے نام نامی سے مشہور ہیں، کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس زمانے میں حضرت میاں میر صاحب کے عارف بزرگ اور صاحبِ دل ہونے کا چھوٹے بڑوں پر انکشاف ہو چکا تھا۔ لہٰذا مُلاّ شاہ بھی دل سے آپ کے ایسے معتقد ہوئے کہ ہمیشہ کے لیے آپ کے مریدانِ خاص کے حلقے میں شامل ہو گئے اور پھر لاہور کو ہی اپنا وطن قرار دیا۔ آنھوں نے سنہ ۱۱۷۲ ہجری

۱۔ شیر خاں لودی: "تذکرۂ مرآۃ الخیال" (سالِ تصنیف ۱۱۰۲ھ؛ باہتمام مرزا ملک الکتاب شیرازی، بمبئی، سال چاپ ۱۳۲۳ھ)، ص ۱۲۸:
"تا آنکہ بکابل آمد و از آنجا برفاقت یکی از تجارِ ہندوستان افتادہ در شہر لاہور بخدمت میاں میرک شاہ کہ حالاتِ ایشان بر صغیر و کبیر ہوایدا ست اعتقاد بہم رسانید۔"

میں وفات پائی اور آج اپنے پیر و مرشد کے مزارِ عالی مقام کے قریب ایک حجرے کی چھوٹی سی مسجد کے صحن میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

ویسے تو آپ کی تصانیف عربی اور فارسی نثر و نظم میں بے شمار ہیں لیکن ان میں سے چند ایک آج بھی خطی نسخوں کی صورت میں پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور، بانکی پور لائبریری (بھارت) اور برٹش میوزم لائبریری لندن میں موجود ہیں۔ ان تمام تصانیف میں سے آپ کی مشہور ترین تصنیف "مثنویاتِ مُلاّ شاہ" ہے، جس پر آج کل پنجاب یونیورسٹی لاہور میں تحقیقی کام شروع ہو چکا ہے اور اس پر پی ایچ۔ ڈی کے مقالات بھی لکھے جا رہے ہیں۔

اگر مُلاّ شاہ لاہوری کی مثنویات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ مُلاّ شاہ نے مولانا روم کے فلسفے کی تقلید میں خود شناسی کے فلسفے کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ لہٰذا اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مُلاّ شاہ لاہوری اس برِصغیر پاک و ہند کے ان عارفانِ بزرگ میں سے ہیں جنھوں نے اسلامی فلسفے کو اپنے خاص انداز میں پیش کیا ہے، جس کا اظہار انھوں نے خود یوں کیا ہے:

"ہر چہ گفتم ہمہ از خود گفتم"

مُلاّ شاہ لاہوری کی مثنویات کا یہ نسخہ خطی چھ ہزار اشعار اور ۳۴۵ برگ پر مشتمل ہے۔ مُلاّ شاہ نے مثنویات کے اس مجموعے کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ "رسالہ ولولہ" کے عنوان سے ہے، دوسرا حصہ "رسالۂ ہوش" اور تیسرا حصہ "رسالۂ نسبت" پر مبنی ہے۔

"رسالۂ ولولہ" میں مُلاّ شاہ نے ولولۂ عشق کے تمام آغازی

مراحل کا تذکرہ کیا ہے جن کے توسل سے انسان اپنے محبوبِ حقیقی کے مقامِ وصال تک پہنچتا ہے اور پھر اُس کا دل ، آفتابِ زار کی طرح ، منوّر و روشن ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اس رسالے کا آغاز آپ نے اسی فلسفۂ وصالِ یار سے کیا ہے جس کا مرکزی خیال یہ ہے :

"از ولولہ وصالِ یارم بنگر دلِ آفتاب زارم"[1]

اس رسالے کے موضوعات مندرجہ ذیل ہیں : در وصف آتش ، در وصفِ گوہر ، در معنیٔ صبر ، در تعریفِ قرار و در معنیٔ عشق۔ پھر اسی طرح در وصفِ نوروز و شب بہار و کمان وغیرہ۔ مندرجہ بالا عنوانات تمام عشق کے متعلق ازم (Symbolism) یعنی علامتوں کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں۔

دوسرا "رسالۂ ہوش" قابلِ ذکر ہے جو فلسفۂ خود شناسی پر مبنی ہے۔

اگرچہ مُلّا شاہ لاہوری اس فلسفۂ خود شناسی کے بیان کرنے میں مولانا روم اور اقبال دونوں کے ہم فکر نظر آتے ہیں ، لیکن مُلّا شاہ کا اندازِ فکر جداگانہ ہے ، مثلاً انھوں نے اسی فلسفۂ خود شناسی کو حواسِ خمسۂ ظاہری اور باطنی کی علامت کے توسل سے بیان کیا ہے اور یہ ان کا اپنا انداز ہے جس کی تفصیل آئندہ سطور میں بیان کی جائے گی۔

تیسرا "رسالۂ نسبت" ہے جو "در وصفِ علم" ، "در وصفِ ہاریات" اور "ساقی نامہ" پر مشتمل ہے۔ یہ رسالہ علومِ معقول و

۱۔ ملا شاہ لاہوری : "مثنویات" ، نسخۂ خطی ، شمارہ Pi-VI-158 پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور ، سال تصنیف ۱۰۵۵ھ ، برگ ۳۴ الف۔

منقول کے علاوہ بہاریات اور ساقی نامہ پر مبنی ہے۔ لہٰذا جب ہم مُلاّ شاہ لاہوری کا موازنہ علامہ اقبال سے کریں گے تو ہمارے سامنے مُلاّ شاہ کی مثنویات کے پہلے دو رسالے یعنی ''رسالۂ ولولہ'' اور ''رسالۂ ہوش'' پیشِ نظر ہوں گے۔ البتہ ''رسالہ نسبت'' میں جہاں کہیں مُلاّ شاہ نے بہاریات کے موضوع پر ''گل گلاب'' کی تعریف کی ہے تو وہاں بھی وحدتِ شہود کا فلسفہ جھلکتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ وہ فرماتے ہیں کہ ہر گل میں خدا کا ہی جلوہ دکھائی دیتا ہے اور ورقِ آفتاب یعنی سورج کی روشنی اس کے نور کا ایک عکس ہے۔ اس خیالؔ کو انھوں نے مندرجہ ذیل شعر میں یوں نظم کیا ہے:

ہمہ گل کہ ہست پایۂ اوست ورقِ آفتاب سایۂ اوست[۱]

اور یہ کہ:

آب گل را چنان پرورده آب را نیز گل چنین کرده[۲]

ملا شاہ، مولانا روم اور فلسفۂ نے:

آئیے اب ''رسالۂ ہوش'' میں ملا شاہ کے ان اشعار پر بحث کریں جن میں وہ مولانا روم کے ہم فکر نظر آتے ہیں۔

اس رسالے میں جہاں ملا شاہ نے ''در تعریفِ نی'' کے عنوان سے اپنے خیالات کا اظہار کیا وہاں وہ مولانا روم کے ہم نوا دکھائی دکھائی دیتے ہیں۔ ملا شاہ کے مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

از لبِ نای، رسیدی سخنم
سینہ سوراخم و آتش بتنم[۳]

۱۔ ۳۔ نسخۂ خطی ایضاً، رسالۂ نسبت، بہاریات، برگ ۲۰۶ الف۔

من لیم گفت ، چرا باشد لاف
سر زند لاف ، چه از سینه شگاف
نالہ سان ، در دل سوز فتیدہ
لاف را کی ، شگافی دیده[۱]

اور یہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں :

عشق دار ، بدل بی کینہ
مینماید ز شگاف سینہ
رازہا در رہ دل ہای گذاشت
چونکہ آولب، بلب نای داشت[۲]

مندرجہ بالا اشعار میں جب ہم پہلے شعر کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو ''از لبِ نای بہ سخن رسیدن'' و ''سوراخہا در سینہ داشتن'' و ''در عشق آتش ہتن شدن'' ، یہ تمام کیفیات ہیں جن کو مولانا روم نے اپنی مثنوی کے ابتدائی اشعار میں یوں منظوم کیا ہے :

بشنو از نی ، چون حکایت میکند
وز جدائی ها ، شکایت میکند
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق
تا بگویم شرحِ دردِ اشتیاق[۳]

پھر جس طرح مولانا روم نے صدائے نے کو آتشِ عشق اور رنگِ مے کو جوشِ عشق سے یوں تعبیر کیا ہے کہ :

۱- ۲- ایضاً ، رسالہ ہوش ، در تعریف نی ، برگ ۶۰ الف ، ۶۰ ب۔
۳- مولانا روم : ''مثنوی معنوی'' تالیف آقای محمد حسن (علمی چاپخانہ ملی ، تہران ، ۱۳۲۰ خ) ، ص ۱۔

آتشِ عشق است کاندر نی فتاد
جوشش عشق است کاندر می فتاد
آتش عشق است این بانگ نای و نیست باد
ہر کہ این آتش ندارد ، نیست باد[1]

اسی طرح ملا شاہ آتشِ نے میں کباب کی طرح سوختہ نظر آتے ہیں اور ان کے ہاں بھی صدائے نے سے نے زار میں یوں آگ لگی دکھائی دیتی ہے :

ما کبابیم از آن آتشِ نی
سوخت ما را ہمہ آتش در وی
چونکہ نای نفس در نی داد
آتشی بود ، بہ نی زار فتاد[2]

پس معلوم ہوا کہ ملا شاہ کا فلسفہ نے وہی ہے جو مولانا روم کا ہے البتہ انداز بیان جداگانہ ہے ۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اندازِ بیان میں ملا شاہ کو وہ مقام حاصل نہیں ہو سکتا جو مولانا روم کو ہے ، تاہم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح مولانا روم نے "نے" کی علامت نگاری میں روح اور جسدِ انسانی کے فلسفے کو نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے ، اسی طرح ملا شاہ لاہوری نے اس برصغیر پاک و ہند کے رہنے والوں کو مولانا کے فلسفہ نے کا پیغام اپنے خاص انداز میں پیش کیا ہے ۔

مولانا روم ، ملا شاہ ، اقبال اور فلسفۂ خود شناسی :

یہاں ایک بات واضح کر دینا لازم ہوگا کہ ملا شاہ لاہوری کا کلام

۱۔ ایضاً مثنوی ، ص ۱ ۔
۲۔ ملا شاہ لاہوری : "مثنویات" مذکور ، برگ ۰۷ الف ۔

علامہ اقبال کی نظر سے نہیں گزر سکا ۔ ملا شاہ کی مثنویات کی تاریخِ تصنیف ۱۰۵۵ ہجری ہے اور رباعیات کا سالِ کتابت ۱۱۸۶ ہجری ہے ۔ مختصر یہ کہ ملا شاہ کی تصانیف میں سے آج ہمارے پاس محض دو نسخے ہیں جو گذشتہ دو سو برس سے آج کی تاریخ تک کہیں بھی شائع نہیں ہوئے ، اور نہ ہی کسی تذکرے میں ان کے شائع ہونے کا کوئی ذکر موجود ہے ۔ اس کے برعکس مولانا روم کی ''مثنوی'' کے نسخے ہر دور سے لے کر آج تک شائع ہوتے چلے آ رہے ہیں ۔ چونکہ یہ خطی نسخے دو سو برس کی گرد کے تلے دب چکے تھے اس لیے شاید علامہ اقبال کی نظر سے نہیں گزر سکے ۔ لیکن یہ بات بالکل واضح اور روشن ہے کہ ملا شاہ نے اقبال سے تقریباً تین سو برس پہلے کے زمانے میں مولانا روم کا بخوبی مطالعہ کیا تھا اور اُن کے فلسفۂ خود شناسی کو نہ صرف اچھی طرح سے سمجھا اور جانچا بلکہ اُن کی تقلید میں اس فلسفۂ خود شناسی کو اپنے خاص انداز میں پیش بھی کیا ہے ۔ اس طرح تین سو برس بعد اسی سر زمین پاک و ہند میں علامہ اقبال نے مولانا روم کے فلسفۂ خود شناسی کا بغور مطالعہ کیا اور اپنے خاص انداز میں فلسفۂ خودی کی صورت میں پیش کیا ہے ۔

لہٰذا اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولانا روم کا یہ فلسفۂ خود شناسی اس برِ صغیر پاک و ہند میں گذشتہ تین سو برس سے ، بلکہ ہو سکتا ہے کہ اس سے بھی پہلے کسی خاص انداز میں پیش کیا جاتا رہا ہو ۔ پھر تین سو برس کے بعد علامہ اقبال نے اپنے خاص انداز میں اسے ''فلسفۂ خودی'' کی صورت میں پیش کیا ۔ اس لیے اگر ہم اسلام کے ان تین مفکرین کو ایک ہی لڑی میں منسلک

کر کے بغور مطالعہ کریں تو یقیناً یہ تینوں مفکرین ہم فکر دکھائی دیتے ہیں اور انھوں نے ایک ہی فکر کو اپنے اپنے خاص انداز میں پیش کیا ہے ۔ اس صورت میں ہر مفکر ایک دوسرے سے اندازِ بیان میں یقیناً جدا ، لیکن معنوی لحاظ سے ہم آہنگ نظر آتا ہے ۔

آئیے اب ہم مولانا روم ، ملا شاہ لاہوری اور علامہ اقبال کے فلسفۂ خود شناسی کو ایک ہی لڑی میں پرو کر دیکھیں ۔

مولانا روم اور ملا شاہ لاہوری :

مولانا روم نے "مثنوی" کے آغاز میں اسی فلسفۂ خود شناسی (Self-Realisation) کو "نے" کی زبان سے یوں پیش کیا ہے :

ہر کسی کو، دور ماند از اصلِ خویش
باز جوید ، روزگارِ وصلِ خویش
ہر کسی از ظنِ خود ، شد یارِ من
از درونِ من نجست ، اسرارِ من
سرِ من ، از نالۂ من دور نیست
لیک چشم وگوش را ، این نور نیست
تن ز جان و، جان ز تن، مستور نیست
لیک کس را، دیدہ جان، دستور نیست[1]

اسی فلسفۂ خود شناسی کے مطابق ملا شاہ لاہوری نے دنیا کو ایک درخت گل اور انسان کو غافل دل بلبل سے تعبیر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ دنیا ایک درختِ گل کی مانند ہے اور انسان ایک

۱۔ مولانا روم : "مثنوی مولوی معنوی" (مطبع نولکشور ، لکھنؤ ، ۱۳۳۴ھ/۱۹۱۶ع) ، ص ۴ ۔

ایسے بلبل کی مانند جو خود اپنے دل سے غافل ہے ۔ اس دنیا میں رہنے والے انسان بلبل کی طرح گل کے عاشق ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ، یا یوں کہیے کہ اس باغِ جہاں میں ہر شخص از خود ایک گل کی طرح حسین و جمیل ہے جو خود اپنے حسن سے ناواقف ہے۔ اور جو بلبل ہونے کا دعویٰ کرتا ہے وہ خود دل سے غافل ہے ۔ اس فلسفے کا اظہار ملا شاہ نے یوں کیا ہے :

این جہان، یک درختی قسمۂ گل
عاشقانش ، ہوای صد بلبل

ہر یکی گُل، ز حسنِ خود غافل
بلبلانش ، تمام غافلِ دل[1]

پھر فرمایا کہ ہر انسان قامت سرو کی مانند ہے جو میدان میں آگے قدم نہیں بڑھاتا ، یا یوں کہیے کہ تمام لب جوئیبار کے کنارے آ کر بھی پیاسے ہیں اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے ساحلِ دیدہ کے چاروں طرف خشک مژگان قطار اندر قطار کھڑے ہوں ۔ اس فلسفے کو ملا شاہ نے یوں منظوم کیا ہے :

قامتِ سرو ، ہر یکی دارند
پای ، در راہ پیش ، نگذارند

ہمہ لب تشنہا لبِ جو بار
ہمہ مژگان بگردِ دیدہ قطار[2]

---

۱ - ۲ - ملا شاہ لاہوری : مثنویات ، (در تعریفِ جہان) نسخۂ خطی ، ایضاً ، برگ ۲۸۷ ب - ۲۸۸ الف ۔

پھر فرمایا کہ تاسف کا مقام ہے کہ سب نے سمندر میں آبِ حیات کو تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن انھیں کوئی آبِ حیات نہ ملا ، حالانکہ آبِ حیات تو خود ان کے دلوں کے سمندر میں موجزن ہے یا یوں کہیے کہ اگر حقیقت بیں نگاہ سے دیکھا جائے تو وہ آبِ حیات تو خود ان کے آئینۂ دل میں روشن و درخشاں ہے لیکن ، کسی نے اپنے دل کو نہیں ٹٹولا ۔ اس فلسفے کا اظہار ملا شاہ نے یوں کیا ہے :

ہمہ را ، سینہ سوز آب حیات
جستہ آبِ حیات ، در ظلمات
ظلمات است ، سینۂ مردم
ہست آبِ حیات ، در وی کم
ہست آن آب ، ہمچو آئینہ
روشن و کس نیافت در سینہ[1]

مولانا روم نے اسی فلسفے کو اس شعر میں نہایت واضح اور روشن انداز میں یوں پیش کیا ہے :

سرِ من ، از نالۂ من ، دور نیست
لیک چشم و گوش را این نور نیست[2]

ظاہر ہے کہ دونوں مفکرین کا فکر تو ایک ہی ہے لیکن انداز بیان اپنا اپنا جداگانہ ہے ۔

۱۔ ایضاً ، برگ ۲۸۸ الف ۔
۲۔ مولانائے روم : ''مثنوی معنوی'' ص ۴ ۔

ملا شاہ اور اقبال :

ملا شاہ لاہوری نے خود شناسی کے اسی فلسفے کو ایک جگہ یوں بیان کیا ہے کہ کوئی خود کو مجنوں سمجھتا ہے اور کوئی لیلیٰ ، لیکن افسوس کہ کسی نے اپنے اوپر نگاہ نہ ڈالی اور خود اپنی ذات کو نہ پہچانا ۔ تمام انسان سراپا حسن کا سمبل (Symbol) یعنی لیلیٰ ہیں اور عشق کا سمبل (Symbol) یعنی مجنوں ہیں اور ان دو صورتوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہیں ۔ انسان خود ہی لیلیٰ اور خود ہی مجنوں ہیں ۔ وہ از خود حسن و عشق کا سراپا ہیں ۔ اگر انسان خود اپنی ذات میں گم ہو کر اپنے آپ کو تلاش کرے تو اپنی حقیقت سے بخوبی آشنا ہو جائے ۔ اس فلسفے کو ملا شاہ نے یوں منظوم کیا ہے :

همہ گویند ، لیلیٰ و مجنون
نہ فتادہ نظر ، بخود اکنون
همہ کس لیلند و مجنونند
ہیچ کس نیست زین دو بیرونند
حسن و عشق است لیلیٰ و مجنون
تو همہ عشق و حسن روز افزون
حسنِ لیلیٰ و عشقِ مجنونی
کس چہ گوید ترا دگر چونی
ز تو چیزی نمی خورد بیرون ۔
همہ در تست لیلیٰ و مجنون[1]

علامہ اقبال نے اسی فلسفۂ خود شناسی کو اپنے خاص انداز

۱۔ ملا شاہ لاہوری : مثنویات ، ایضاً برگ ۲۸۸ الف ۔

"فلسفۂ خودی" کی شکل میں زیادہ روشن اور واضح تر یوں منظوم کیا ہے :

کرا جوئی ، چرا در پیچ و تابی ؟
کہ او پیداست ، تو زیرِ نقابی
تلاشِ او کنی ، جز خود نہ بینی
تلاشِ خود کنی ، جز او نیابی[1]

پھر خودی اور بے خودی کے رموز و نکات سے انسان کو آگاہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اے انسان جوہرِ نور تو خود تیری خاک میں پوشیدہ ہے - اور پھر خویش دار و خویش باز و خویش ساز کا پیغام ان خوبصورت اشعار میں یوں پیش کیا ہے :

تو خودی از بی خودی نشناختی
خویش را اندر گمان انداختی
جوہرِ نوریست اندر خاکِ تو
یک شعاعش جلوۂ ادراکِ تو

خویش دار و خویش باز و خویش ساز
نازہا می پرورد اندر نیاز[2]

پھر "اسرارِ خودی" کے انکشافات کرتے ہوئے ہمیں یہ پیغام دیا کہ جب انسان نے اپنے پیکر ہستی میں گم ہو کر خودی کو بیدار

۱- "پیامِ مشرق" ، لالہ طور ، رباعی ۸۱ ، (لاہور ، شیخ غلام علی اینڈ سنز ۱۹۶۶ع ، ص ۵۱ -

۲- "اسرار و رموز" (لاہور ، شیخ غلام علی اینڈ سنز ، ۱۹۷۱ع) ، ص ۹۹ -

کیا تو اس کے سامنے تمام کائنات سمٹ کر آشکار ہو گئی ۔ اور یہ بھی بتایا کہ انسان کی ذات میں سینکڑوں جہان پوشیدہ ہیں ۔ اور اس فلسفہ خودی کا اظہار علامہ اقبال نے یوں کیا :

پیکر ہستی ز آثارِ خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است
خویش تن را چون خودی بیدار کرد
آشکارا عالمِ پندار کرد
صد جہان پوشیدہ اندر ذاتِ او
غیرِ او پنداشت از اثباتِ او[1]

مختصر یہ کہ اگر اس برِ صغیر پاک و ہند کی تاریخِ ادب کے میدان میں تحقیق کی جائے تو یقیناً اس خاکِ پاک میں آج بھی ایسے سخنورانِ شیریں مقال اور مفکرینِ بے مثال موجود ہیں جنھوں نے اپنے دور میں آنے والی نسلوں کی رہنمائی کے لیے پوری انسانیت کو درسِ عمل دیا ہے ۔ اگر ہم ان بزرگوں کے افکار کی میراث کو پھر سے حاصل کریں تو یقیناً وہ دن دور نہیں جب ہم پھر سے اپنی کھوئی ہوئی عظمت اور وقار حاصل کر سکیں گے ۔

★ ★ ★

۱- ایضاً ، ص ۱۲ ۔

۴

علامہ اقبال اور سلطان باھو کے کلام میں "ھُو" کی علامت

آج جبکہ انسان مادہ پرستی کی طرف تیزی سے دوڑ رہا ہے اور اس دوڑ میں اتنا آگے نکل گیا ہے کہ حیاتِ انسانی کے اصل مقصد سے ہٹ کر فنا فی الدنیا ہو کر رہ گیا ہے، ایسے پُر آشوب اور پُر فتن دور میں یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے آبا و اجداد کے افکارِ گراں مایہ کی پھر سے تحقیق و تدقیق کر کے آج کے انسان کے سامنے پیش کریں تا کہ وہ حیاتِ انسانی کے اصل مقصد سے آشنا ہو اور اس دنیائے فانی میں رہتے ہوئے انسان اور خدا کے درمیان رشتہ قائم کر کے حیاتِ ابدی حاصل کر سکے۔

پندرھویں صدی ہجری کا سورج اپنی پوری تابانی سے طلوع ہو چکا ہے جسے اسلامی نقطۂ نظر سے قرنِ اسلامی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ وقت نزدیک آ رہا ہے جب انسان فلسفۂ توحید کے مطابق اس دنیا میں رہتے ہوئے اپنے خالقِ حقیقی سے رشتہ قائم کر کے راہِ نجات کی طرف لوٹے گا۔

اس سے پہلے کہ ہم علامہ اقبال اور سلطان باھو کے کلام میں "ھُو" کی علامت پر بحث کریں، پہلے سلطان باھو کا تعارف اور اُن کے کلام کا تجزیہ پیش کرتے ہیں۔

سلطان باھو" کا تعارف:

سلطان باھو مغل سلطنت کے آخری دور یعنی اورنگ زیب عالمگیر

کے زمانے کے شاعر ہیں جبکہ ہر صغیر پاک و ہند میں فارسی زبان سرکاری زبان تھی۔ اس دور کا ہر دانشور، صوفی شاعر اور ادیب اکثر فارسی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا تھا۔ البتہ بعض ایسے صوفی شعرا بھی تھے جو نہ تو کسی عہدے پر فائز تھے اور نہ ہی کسی شاہی دربار سے منسلک تھے، بلکہ وہ تمام قیود سے آزاد ہو کر خدائے واحد کا پیغام انسانیت کو پہنچاتے تھے۔ انھی صوفی شعرا میں سلطان باھو کا نام نامی بھی آتا ہے۔ سلطان باھو کی فارسی نظم و نثر میں بے شمار تصانیف آج بھی موجود ہیں، لیکن ان میں سے سلطان باھو کا فارسی دیوان، فارسی ادبیات میں اپنا خاص مقام رکھتا ہے۔

سلطان باھو کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے عوام و خواص دونوں طبقوں کے لوگوں کے لیے بہت کچھ کہا ہے۔ اس دور کے اکثر صوفی شعرا نے خواص کے لیے فارسی زبان اور عوام کے لیے بر صغیر پاک و ہند کی مقامی زبانوں میں پیغامِ حق پہنچایا ہے، جس کی آج عصر حاضر کے مسلمانوں کو از حد ضرورت ہے۔ اسی طرح یہ وہی سلطان باھو ہیں جنھوں نے فارسی زبان کے علاوہ، اپنی مقامی زبان پنجابی میں ان سادہ دل عوام کے لیے بھی پیغام حق پہنچایا ہے جو صبح سے شام تک ایک کولھو کے بیل کی مانند مسلسل کام کرتے، کھاتے پیتے اور سو جاتے ہیں، لہٰذا سلطان باھو نے فلسفۂ توحید کو عوام کی سادہ اور عام زندگی کی علامتوں میں ڈھال کر نہایت آسان طریقے سے سمجھایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے فارسی کلام کی بہ نسبت پنجابی کلام زیادہ دلکش اور مؤثر ثابت ہوا ہے، اور بر صغیر پاک و ہند میں وہ پنجابی زبان کے معروف صوفی شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں۔

لیکن اگر حقیقت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو ان کا فارسی کلام بھی کم نہیں۔ اس میں بھی ہمیں سلطان باھو کے افکارِ گراں مایہ جواہرِ آبدار کی طرح دستیاب ہوتے ہیں۔

سلطان باھو کا فلسفۂ توحید:

سب سے پہلے ہم سلطان باھو کے فارسی کلام میں فلسفۂ توحید پر بحث کرتے ہیں۔ مثلاً سلطان باھو کے فارسی دیوان کی پہلی غزل کا مطلع یوں شروع ہوتا ہے:

یقین دانم درین عالم کہ لامعبود اِلاّ ھُو
وَلا موجود فی الکونین لامقصود اِلاّ ھُو

سلطان باھوؒ نے یہ بات ایسے ہی نہیں کہہ دی ہے بلکہ تمام علم و عمل کی منازل طے کرنے کے بعد جب وہ عشقِ حقیقی کے میدان میں قدم رکھتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ سوائے اللہ کے اور کوئی معبود نہیں اور دونوں جہانوں میں مقصدِ حیاتِ انسانی یہی ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی انسان کا رشتہ مخلوق ہونے کی حیثیت سے خالقِ حقیقی سے اور عبد (بندہ) ہونے کی صورت سے اپنے معبودِ حقیقی سے منقطع نہ ہو۔ لہذا وہی "ھُو" ہے اور وہی "حق" ہے۔ اس کا اظہار سلطان باھو نے دوسرے شعر میں یوں کیا ہے:

ھو الھُو ھُو، ھو الحق ھُو، ندانم غیرِ اِلاّ ھُو
ھو الھُو ھُو، ھو الحق ھُو، نخوانم غیرِ اِلاّ ھُو

دنیاوی زندگی کے تجربات حاصل کرنے کے بعد جو انہیں علم سے حاصل ہوئے، اس کا تجزیہ واضح اور روشن الفاظ میں یوں کیا کہ

جب میں تمام عالم میں گھوما پھرا تو مجھے سوائے اس ھُو کے اور کچھ دکھائی نہ دیا اور تمام دنیا میں مجھے اسی کا حسن و جمال پسند آیا، کیونکہ دنیاوی حسن و جمال فانی اور وقتی ہے، اور خود خالقِ حسن و جمال کا حسن ازلی، ابدی اور لا زوال ہے۔ ان افکار کا اظہار یوں فرماتے ہیں:

بگرد عالم چو گردیدم، ھو الحق ھُو پسندیدم
یکی خواندم، یکی دیدم، ندیدم غیر، الا ھُو

ملتِ اسلامیہ آج جس نازک دور سے گزر رہی ہے، اگر اس نازک دور میں ہم فلسفۂ توحید پر عمل کریں تو ہمیں کسی بڑی سے بڑی طاقت یا سپر پاور کا کوئی ڈر یا خوف نہیں ہو سکتا، اور نہ ہی اس سے ہمیں شکست ہو سکتی ہے: فرمانِ الٰہی ہے "الا ان اولیاء اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون" خبردار! (سن رکھو) بے شک جو اللہ کے دوست ہیں انھیں نہ ہی تو کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمزدہ ہوں گے۔" بلکہ اس واحدِ قدوس کی طرف سے بھیجی ہوئی فتح و نصرت ہمارے قدم چومے گی۔

سلطان باھو کا پیغام یہ ہے کہ جب تو "لا" کی تلوار حاصل کر لیتا ہے تو پھر اگر تو اکیلا بھی ہو، تجھے کوئی غم نہیں ہونا چاہیے، لیکن شرط یہ ہے کہ تو سوائے اس خدائے واحد کے اور کسی سے مدد طلب مت کر کیونکہ فتح و نصرت تو اس خالقِ کل ھُو کے اختیار میں ہے۔ اس کے حکم کے بغیر کوئی فتح کرنے والا نہیں۔ اسی فلسفۂ توحید کا اظہار سلطان باھو نے مندرجہ ذیل اشعار میں یوں کیا ہے:

چو تیغِ لا بدست آری ، یا تنہا ، چہ غم داری
بجُو از غیرِ حق یاری ، کہ "لا" مفتاحِ "الا" "ھو"

اسی طرح ایک اور فارسی غزل میں فلسفۂ توحید کے اس موضوع کی یوں وضاحت کی ہے :

یا تنہا درین وادی "ھو" الواحد ، "ھو" الہادی
رسد ہردم ترا شادی ، تو شو خود یارِ مستانہ
سخن از "لا" چہ میگوئی ، تو "ھو" با "ھو" نمی جوئی
چرا با غیر می پوئی "ھو الھو" گو ، چو مستانہ
چون مستان نوش این می را ، فنا کن ما و من خود را
بجو باھو تو یا "ھو" را ، صلا زد پیرِ میخانہ

باھو کے کلام میں "ھو" کی علامت :

اگر ہم سلطان باھو کے مذکورہ اشعار کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ سلطان باھو کے کلام میں "ھو الواحد" اور "ھو الہادی" خدا کی وحدانیت کا اقرار ہے ، بالخصوص یہ شعر ملاحظہ ہو :

سخن از لا چہ میگوئی ، تو "ھو" باھو نمی جوئی
چرا با غیر می پوئی "ھو الھو" گو چو مستانہ

مذکورہ شعر میں "ھو" را "با ھو" جستن ، تلاشِ حق کی شرط ہے جس کی جزاء "ھو الھو" ہے ، یعنی اگر ہم اس خدائے واحد کو تلاش کریں تو ہمیں بایقین سوائے اس "ھو" کے اور کوئی معبود اور خالق نظر نہیں آئے گا ، لہذا اس شرط و جزا کے بعد ظاہر ہوا کہ سلطان باھو کے کلام میں "ھو" خدا کی وحدانیت کا ایک سمبل

یعنی ایک علامت ہے۔

علامہ اقبال کے کلام میں "ھو" کی علامت:

اگر سلطان باہو کے اس فلسفۂ توحید کا جسے انھوں نے "ھو" کی علامت میں پیش کیا، علامہ اقبال کے "فلسفۂ توحید" سے موازنہ کیا جائے تو علامہ اقبال کے اردو اور فارسی کلام میں "مے" اور "ھو" کی وہی علامتیں نظر آئیں گی جو سلطان باہو کے فارسی کلام میں موجود ہیں۔ مثلاً علامہ اقبال کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

مٹا دیا مرے ساقی نے عالمِ من و تو
پلا کے مجھ کو مئے لا الٰہَ الاّ ھو

اسی طرح "ضربِ کلیم" کی ایک نظم بعنوان "محراب گل افغان کے افکار" میں یہ شعر ملاحظہ ہو:

لا دینی و لاطینی کس پیچ میں الجھا تو
دارو ہے ضعیفوں کا "لا غالبَ الاّ ھو"

اس نظم کا ایک شعر اور دیکھیے جس میں علامہ اقبال نے ملت اسلامیہ کو یہ مژدہ سنایا ہے کہ اے مسلمان اگر تیرے دل میں "لا شریک لہ" کا تصور عملاً اتر جائے تو جہان میں یگانہ و یکتا شمار کیا جائے گا۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

رہے گا تو ہی جہان میں یگانہ و یکتا
اتر گیا جو ترے دل میں "لا شریکَ لہٗ"

نفی اور اثبات کی علامتیں:

علامہ اقبال نے اپنے فارسی کلام میں اسی فلسفۂ توحید کو

"مے" اور "ھو" کی علامتوں کے علاوہ نفی اور اثبات کی انھی علامتوں میں پیش کیا ہے جس طرح سلطان باھو نے اپنے پنجابی کلام میں۔ مثلاً "اسرارِ خودی" میں علامہ اقبال کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

عشق را از شغلِ "لا" آگہ کن آشنای رمزِ الا اللہ کن

اوپر کے شعر میں فلسفۂ توحید یعنی رمزِ الا اللہ کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اگر کوئی رمزِ الا اللہ سے آشنا ہونا چاہتا ہے تو اسے سب سے پہلے "لا" یعنی نفی کی منزل طے کرنا ہوگی اور اس کے لیے ضروری ہے کہ انسان کے دل میں جتنے بھی معبود ہیں انھیں دل سے باہر نکال پھینکے۔ جب دل خالی اور مصفا ہوگا تب اس میں الا اللہ یعنی سوائے اللہ کے اور کوئی معبود نہ ہوگا۔ اس طرح انسان "لا" یعنی نفی کی منزل سے "الا اللہ" یعنی اثبات کی منزل تک پہنچ سکتا ہے۔

اسی طرح جاوید نامہ میں علامہ اقبال نے عطارد میں "پیغام اقبال بہ ملت روسیہ" کے عنوان سے ایک نظم میں نفی اور اثبات کے اسی موضوع کو یوں منظوم کیا ہے:

کہن شد او رنگ را آئینِ دین سوی آن دیرِ کہن دیگر مبین
کردۂ کارِ خداوندان تمام بگذر از لا، جانب الا خرام
درگزر از لا، اگر جویندۂ تا رہِ اثبات گیری زندۂ
ای کہ می خواہی نظامِ عالمی جستہ او را اساسِ محکمی

اوپر کے اشعار میں علامہ اقبال اہلِ اسلام کو "لا" یعنی نفی کی منزل سے گذر کر "الا اللہ" یعنی اثبات کی منزل پر گامزن ہو کر زندۂ جاوید ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ بالخصوص اوپر کا یہ شعر

قابلِ غور ہے:

در گذر از لا اگر جوینده ای تا رہِ اثبات گیری زنده ای

سلطان باھو کے پنجابی کلام میں "ھو" کی علامت:

اب ہم سلطان باھو کے پنجابی کلام میں "ھو" کی علامت کی وضاحت کرتے ہیں۔

سلطان باھو کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے توحید کے اس اہم فلسفے کو خواص کے علاوہ عوام کی زبان میں عوام میں بیٹھ کر ان کی روزمرہ زندگی کی علامتوں میں پیش کیا ہے، تاکہ وہ اسے نہ صرف آسانی سے سمجھ سکیں بلکہ اس پر عمل کرتے ہوئے حیاتِ ابدی حاصل کر سکیں۔ مثلاً سلطان باھو کے پنجابی دیوان کا آغاز فلسفۂ توحید سے ہوتا ہے جسے انھوں نے نفی اور اثبات کی علامتوں میں یوں پیش کیا ہے:

الف اللہ چنبے دی بوٹی مرشد من وچ لائی ھُو
نفی اثبات دا پانی ملیا ہر ہر رگ ہر جائی ھُو
اندر بوٹی مشک رچایا، جان پھلن پر آئی ھُو
جیوے مرشد کامل باھو جیں ایہہ بوٹی لائی ھُو

اگر ہم سلطان باھو کے فارسی کلام کا پنجابی کلام سے مقابلہ کریں تو معلوم ہو گا کہ سلطان باھو نے اپنے فارسی کلام میں فارسی کی موروثی علامتیں یعنی "مے" اور میخانہ میں پیش کر کے اس کی وضاحت کی ہے۔ اس ضمن میں وہ علامہ اقبال کے علاوہ دیگر فارسی صوفی شعرا مثلاً حضرت امیر خسرو، عمر خیامؒ، حافظ، سعدی، مولانا روم، جامی، شاہ ابوالمعالی اور شاہ بو علی قلندر کی طرح

موروثی علامتیں استعمال کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، لیکن جب وہ پنجابی کلام میں اسی فلسفۂ توحید کی وضاحت کرتے ہیں تو فارسی موروثی علامتوں کو چھوڑ کر خالص مقامی علامتوں میں پیش کرتے ہیں۔ مثلاً اوپر کے اشعار میں چنبے کی بوٹی کا دل میں مشک رچانا اور مرشد کے توسل سے نفی اور اثبات کا پانی دے کر اس کی پرورش کرنا مقامی عوام کے لیے ایسی عام فہم علامتیں ہیں جن سے وہ فلسفۂ توحید کے اہم فلسفے کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر یہی علامتیں فارسی کلام میں استعمال کی جائیں تو اہلِ فارس کے لیے ایک معمہ بن کر رہ جائیں گی۔

ھُو کی روحانی اور معنوی علامت :

علامہ اقبال کے استاد میر حسن کے ہم عصر اور دوست جناب محمد فیروز الدین فیروز ڈسکوی نے عربی ''لغات فیروزی'' میں ''ھو'' کے معنی یوں تحریر کیے ہیں (ص ٦١٦) : ھو (ہ) وہ مرد۔ ضمیر واحد مذکر غائب۔ یعنی ''ہ'' کے اوپر پیش ہے اور واؤ کے اوپر زبر ہے، اس کا مادہ ھُوّ ہے لیکن ھُو پڑھا جاتا ہے۔ یہ اسم اشارہ ہے، اس لیے عام طور پر ''ھو'' سے مراد ''وہ'' ذات باری تعالیٰ ہے، لہٰذا ''ھو'' کی معنوی علامت تو ذاتِ باری تعالیٰ ہے جو واحد ہے۔ وہی اول وہی آخر وہی ظاہر وہی باطن اور ازلی ابدی ہے۔

دوسری ''ھو'' کی روحانی علامت ہے، جبکہ انسان ''ھو'' کا روحانی انداز میں ذکر کرے۔ اس کی مثال ہمیں سلطان باھو کے پنجابی کلام میں ملتی ہے۔

سلطان باھو اور "ھو" کی روحانی علامت :

سلطان باھو نے اپنے پنجابی کلام میں "ھو" کو روحانی اور معنوی علامت کے طور پر پیش کیا ہے۔

مثلاً سلطان باھو کے پنجابی کلام میں "ھو" کو معنوی اور روحانی علامت میں یوں منظوم کیا گیا ہے :

یار یگانہ ملـی تینوں جے سر دی بازی لائیں ھُو
عشق اللہ وچ ہو مستانہ ، ھُو ھُو سدا الائیں ھُو
نام تصور اسم اللہ دے ، دم نوں قید لگائیں ھُو
ذاتے نال جا ذاتی رلیا ، تد باھو نام سدائیں ھُو

یہاں پہلے شعر کے مصرع ثانی میں "ھو" دو صورتوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً اگر ہم یوں پڑھیں کہ :

"عشق اللہ وچ ہو مستانہ ھو ھو سدا الائیں"

تو بات مکمل ہو جاتی ہے۔ یہاں "ھُو ھُو" سے مراد ذات باری تعالیٰ کے نام کا ورد کرنا مقصود ہے۔ لیکن اوپر کے بند میں ہر مصرعے کے آخر میں جو "ھُو" کا لفظ لایا گیا ہے وہ اضافی ہے۔ اگر مذکورہ آخر کے لفظ "ھُو" کو نہ بھی پڑھا جائے تو اشعار کے معنی میں کوئی فرق نہیں آتا ، لہٰذا یہاں "ھُو" کا لفظ اپنی روحانی علامت میں اس لیے منظوم کیا گیا ہے تاکہ ہر پڑھنے اور سننے والے کے دل اور دماغ پر "ھُو" کو لمبا کھینچ کر پڑھتے ہوئے ایک گہرا اثر ہو۔ اس طرح روحِ انسانی کو ذات باری تعالیٰ کا تصور کر کے منزل وصال تک پہنچنے کے لیے ترغیب دلانا بھی مقصود ہے ، تاکہ ہر دنیادار ، جو دنیاوی حرص و ہوا میں گم ہو چکا ہو ۔ تھوڑے عرصے

کے لیے روحانی طور پر دنیا و مافیہا سے نکل کر ''ھو'' کو لمبا کھینچ کر پکارے اور ذات باری کا تصور کر کے روحانیت کی لذت حاصل کرے۔ یہ ''ھو'' کی کیفیت ''روحانی علامت'' میں موجود ہے۔

''ھو'' کی دوسری کیفیت وہ معنوی علامت ہے، جبکہ ''ھو ھو سدا الائیں'' میں ''ھو ھو'' کے لغوی معنی ''اللہ اللہ'' مراد ہے، یہاں ''ھو'' سے مراد ذات باری تعالیٰ ہے۔ یہ اس کی معنوی علامت ہے۔

سلطان باھو نے عوام کو نہ صرف فلسفۂ توحید سمجھایا ہے بلکہ اُسے صاحبِ حال بنانے کی باقاعدہ ترغیب بھی دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سلطان باھو کا پنجابی کلام عام پڑھنے اور سننے والے کے دل و دماغ پر ایک گہرا اثر کرتا ہے۔

مثلاً سلطان باھو کے مندرجہ ذیل اشعار زبان زدِ عام ہیں، جنھیں تمام لوگ جاہل، عالم، فاضل، صوفی، درویش، سالک اور صاحبِ حال، پڑھ یا سن کر اپنی اپنی استطاعت کے مطابق سر دھنتے ہیں:

دل دریا سمندروں ڈونگے، کون دلاں دیاں جانے ھُو
وچے بیڑے وچے جھیڑے، وچے ونجھ مہانے ھُو
چوداں طبق دلے دے اندر، تنبو وانگوں تانے ھُو
جو دل دا محرم ہووے باھو، سویو رب پچھانے ھُو

دل ہی وہ محضر ہے جہاں روحِ انسانی کا قیام ہے اور روح من امرِ ربی ہے، لہٰذا روحِ انسانی کا تعلق اس خالقِ انسانی سے ہے جس نے "نفخت فیہ من روحی" کے مطابق اپنی روح کو جسدِ انسانی میں پھونک کر اس کا رشتۂ عشق اپنے سے قائم کیا ہے۔ اس

لیے دل ہی وہ مقام ہے جہاں روحانی طور پر خالق و مخلوق اور عبد و معبود کی حیثیت سے خدا اور انسان کے درمیان تعلق قائم ہوتا ہے۔

باھو اور "ھو" کی معنوی علامت "الا ھو":

مختصر یہ کہ ہمیں سلطان باھو کے پنجابی اور فارسی کلام کا اور علامہ اقبال کے اردو اور فارسی کلام کا گہرا مطالعہ کر کے "ھُو" کی علامت سے استفادہ کرنا چاہیے۔ مثلاً اگر سلطان باھو اپنے پنجابی کلام میں روحانیت کی ترغیب دیتے ہیں تو فارسی کلام میں وہ ہمیں اجتہاد و عمل کا یوں پیغام دیتے ہیں:

چو تیغِ "لا" بدست آری، بیا تنہا چہ غم داری
بجو از غیرِ حق یاری، کہ لا فتاح الا ھُو

وقت کا تقاضا ہے کہ ہم سلطان باھو کے اسی پیغام "بجو از غیرِ حق یاری" پر عمل پیرا ہوتے ہوئے کسی سپر پاور سے مدد طلب نہ کریں، بلکہ اُس خالقِ کل اور مالکِ حقیقی سے امداد لیں۔ در حقیقت وہی ایک ایسی ازلی اور ابدی سپر پاور ہے جو ان تمام دنیاوی سپر پاوروں کی خالق ہے۔ تو ثابت ہوا کہ مخلوق کا خالق سے کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔ جب ہم اُس خالقِ حقیقی کا سہارا لیں گے تو پھر حق کے سامنے دنیا کی کوئی طاقت مقابلہ نہ کر سکے گی۔ ہم ایک ایسی سپر پاور بن جائیں گے جو دوسری چھوٹی طاقتوں کو کچلنے کی بجائے اُن کی دستگیری اور اعانت کرے گی۔ پھر علامہ اقبال کا یہ خواب بھی پورا ہوگا جو "پیام مشرق" کے 'نقش فرنگ' میں موجود ہے:

آن زمینی کہ برو گریۂ خونین زدہ ام
اشکِ من در جگرش لعلِ گراں خواہد بود

اقبال اور "ھو" کی معنوی علامت :

جس طرح ہمیں سلطان باھو کے فارسی کلام میں "ھُو" کی معنوی علامت "اِلاّ ھُو" میں مضمر نظر آتی ہے، اسی طرح علامہ اقبال کی ضربِ کلیم کی نظم بعنوان "محراب گل افغان کے افکار" میں "اِلا ھُو" کی معنوی علامت دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً :

لا دینی و لا طینی، کس پیچ میں الجھا تو
دارو ہے ضعیفوں کا لا غالبَ اِلاّ ھُو

علاوہ ازیں علامہ اقبال ہمیں "اِلا اللہ" کی رمز سے آشنا ہونے کی یوں دعوت دیتے ہیں، جس میں ملت اسلامیہ کی کامیابی کا راز نہاں ہے :

عشق را از شغلِ لا آگاہ کن آشنائے رمزِ اِلاّ اللہ کن

علامہ اقبال نے اپنے کلام میں من و تو کا جھگڑا ختم کر کے نہ صرف اتحادِ عالمِ اسلامی کی دعوت دی ہے بلکہ فلسفۂ توحید کے زیر اثر "لا اِلٰہ اِلاّ ھُو" پر عمل پیرا ہونے کا یوں اظہار بھی کیا ہے :

مٹا دیا مرے ساقی نے عالمِ من و تو
پلا کے مجھ کو "مئے لا اِلٰہَ اِلاّ ھُو"

یہاں "ساقی" سے مراد خالقِ کل خدا کی ذات ہے جس نے "لا اِلٰہَ اِلاّ ھُو" کی تعلیم دی۔ "اِلاّ ھُو" سے مراد سوائے اُس

کے یعنی "سوائے خدا کے" جس ہستیِ بزرگ و برتر نے اپنے پیغمبر آخر الزمان رسول مقبول کے توسل سے تمام آنے والی نسلوں کو "لا اِلٰہ اِلاّ ھُو" کا آخری پیغام بھیجا کہ سوائے خدا کے کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

جب انسان رمز "اِلاّ اللہ" سے آشنا ہو جاتا ہے، اور عشقِ حقیقی کے میدان میں "الاّ ھُو" کی لذت سے مخمور ہو جاتا ہے تو اس "مئے معرفت" کا نشہ ایسا ہے جو کبھی بھی نہیں اترتا، اور انسان اس "الاّ ھُو" کے جذبے سے سرشار ہو کر خدا کی اس نیابت تک جا پہنچتا ہے جہاں اس خالقِ کل نے انسان کو "خلیفۃ الارض" ہونے کا درجہ عطا کیا ہے۔ یہ درجۂ نیابت اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ انسان اس خالقِ کل کو اپنا خالق اور خود کو عبد (بندے) کی حیثیت سے نہ صرف فکری اور دلی طور پر تسلیم کرے بلکہ عملاً تمام معبودوں کو دل سے نکال کر دل کو مصفا و صاف کرے۔ تب وہ "لا" یعنی نفی کی منزل عبور کر سکتا ہے اور پھر جا کر "اِلاّ اللہ" یعنی اثبات کی منزل آتی ہے۔ جب اثبات کی منزل یعنی "اِلاّ اللہ" کی رمز سے آشنا ہو جائے تو پھر اس کے سامنے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت یا سپر پاور کوئی طاقت نہیں رکھتی۔ وہ بلا خوف و خطر آتشِ نمرود میں بھی چھلانگ لگا سکتا ہے، اور شہیدِ اعظم کی طرح کربلا میں شہید ہو کر حیاتِ جاوید بھی حاصل کر سکتا ہے، لہٰذا "اِلاّ اللہ" کی بنیاد ہی عشقِ حقیقی پر ہے۔ یہ وہ فلسفۂ عشق ہے جسے انسانی عقل سمجھنے سے قاصر ہے۔ محض عاشقانِ الٰہی ہی اسے محسوس کر سکتے ہیں، اس لیے علامہ اقبال نے اس کا اظہار یوں کیا ہے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی

وقت چاہتا ہے کہ ہم اور بالخصوص ہماری نوجوان نسل پیغمبر آخرالزمان رسول مقبول ؐ کے اسی آخری پیغام ''لا الہ الا اللہ'' کی رمز سے آشنا ہو کر اس پر عمل پیرا ہو۔ علامہ اقبالؒ کے اس پیغام کو مشعل راہ بنا کر اسلام کے احیاء اور پاکستان کے ارتقاء کے لیے اگر تن من دھن اور جان و مال کی قربانی دینا پڑے تو ہرگز دریغ نہ کرے۔ پھر یقیناً مسلمانوں کی نوجوان نسل آنے والے زمانے کی امامت کر سکے گی۔ علامہ اقبال کا وہ پیغام یہ ہے:

عشق را از شغلِ ''لا'' آگاہ کن   آشنای رمزِ ''الا اللہ'' کن

* * *

۵
اقبال اور پاکستانی نوجوان

حکیمِ ملّت :

حکیمِ ملت علامہ اقبال کی نگاہ جب اپنی قوم پر پڑی تو انھیں ساری قوم ایک راہ گم کردہ گروہ کی طرح منتشر دکھائی دی اور انھیں راہ گم کردہ قوم کا ایک ہجوم سا نظر آیا ۔ انھوں نے اس ہجوم کو آواز دی اور اپنی "بانگ درا" سے انھیں ایک کارواں بنا دیا ۔ اس کا اظہار علامہ اقبال نے خود 'پیامِ مشرق' میں "لالۂ طور" کی ایک رباعی میں یوں کیا ہے :

عجم از نغمہ ہای من جواں شد
ز سودایم متاعِ او گراں شد
ہجومی بود رہ گم کردہ در دشت
ز آوایِ درایم کاروان شد

دیدۂ بینا :

علامہ اقبال ایک شاعر رنگیں نوا اور دیدۂ بینائے قوم تھے ۔ فطرت کا بھی یہ تقاضا ہے کہ اگر انسان کے جسدِ خاکی کا کوئی ایک عضو درد میں مبتلا ہو تو آنکھ رو پڑتی ہے ۔ اسی طرح علامہ اقبال کے خیال میں شاعر بھی قوم کی ایک آنکھ ہے جو افرادِ قوم کے درد کو اپنا ہی درد جانتی ہے ۔ وہ قوم کے افراد کے دکھ کو اپنا ہی دکھ سمجھ کر رو پڑتی ہے ۔ علامہ اقبال کے نزدیک قوم گویا ایک جسم کی مانند ہے اور اس کے افراد ، اعضائے جسم کی مانند ہیں ۔ مثلاً مزدور ، کسان اور صنعت کار قوم کے دست و پا کی طرح ہیں ۔

قوم کا چہرۂ زیبا نظامِ حکومت پر مشتمل ہے۔ شاعر قوم کی ایسی آنکھ ہے جو دیدۂ بینا رکھتی ہے۔ اس کے درد کو محض دیکھتی ہی نہیں بلکہ محسوس کرتی ہے اور یہی وہ جذبۂ احساس ہے جو ایک شاعر کو دیدۂ بینا عطا کرتا اور ایک انسان کو انسان بنا دیتا ہے۔ اس تمام فلسفے کا اظہار علامہ اقبال نے "بانگ درا" کی ایک مشہور نظم "شاعر" میں کیا ہے۔ اس نظم کا آخری شعر قابلِ غور ہے:

مبتلائے درد کوئی عضو ہو، روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

اقبال دیدۂ بینا رکھنے کے علاوہ، حکیمِ ملت بھی تھے۔ جب انھوں نے اپنی قوم کی نبض پر ہاتھ رکھا تو انھیں اس بیمار اُمت میں کئی نیم جان جسم بھی ملے، جن میں ابھی تھوڑی سی جان باقی تھی۔ چنانچہ وہ جان گئے کہ ابھی اس اُمت میں دَمِ خَم باقی ہے، لہٰذا انھوں نے خدا سے شکوہ کرتے ہوئے آخر میں یہ دعا بھی مانگی:

مشکلیں اُمتِ مرحوم کی آساں کردے
مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کردے
جنسِ نایابِ محبت کو پھر ارزاں کردے
ہند کے دیر نشینوں کو مسلماں کردے

مسلم نوجوان:

علامہ اقبال محض دعا کے ہی قائل نہ تھے ـــ وہ خدائے ذوالجلال سے اُمت مسلمہ کو پھر سے زندہ کرنے کے لیے دعا کرنے کے ساتھ ساتھ قوم کو درسِ عمل دینے کے بھی قائل تھے۔ وہ ایک فلسفی ہونے کی حیثیت سے یہ بھی جانتے تھے کہ اگر کسی قوم کو

میدانِ عمل میں لانے کی دعوت دینا ہو تو اس قوم کی نوجوان نسل کو درسِ عمل دے کر اسے خواب غفلت سے بیدار کیا جا سکتا ہے، لہٰذا انھوں نے نوجوان نسل کو پیامِ بیداری دیا۔ انھوں نے ان کا تقابل اپنے ان آبا و اجداد اور اسلاف کے افعال و کردار سے کرتے ہوئے یہ احساس دلایا کہ وہ ایک ایسی قوم کے سپوت ہیں جس نے دنیا کی وقتی اور فانی شہنشاہیت کو اپنے قدموں تلے کچل ڈالا تھا۔ جن کا شعار شانِ امارت میں ''الفقر فخری'' رہا۔ اس کا اظہار علامہ اقبال نے 'بانگ درا' کی مشہور نظم بعنوان ''خطاب بہ جوانانِ اسلام'' میں یوں کیا ہے:

کبھی اے نوجواں مسلم تدبّر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا
تمدن آفریں، خلاق آئینِ جہانداری
وہ صحرائے عرب، یعنی شتربانوں کا گہوارا

اور ان کی شان و شوکت کا آج کے مسلم نوجوان سے تقابل کرتے ہوئے فرمایا:

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیّارا
گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریّا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

علامہ اقبال نے نوجوان مسلم کو اپنے آباو اجداد کی میراث حاصل کرنے کے لیے اس کا حل یہ بتایا ہے کہ اے نوجوان مسلم

تجھے اپنے آبا و اجداد کی میراث ، جو مثالی کردار و اعلیٰ اقدار پر مبنی تھی ، پھر سے حاصل کرنا ہو گی۔ آنے والی نوجوان مسلم نسل جو آج کے پاکستانی نوجوان ہیں ، انھیں اپنے ابا و اجداد کی اُس میراث کو تلاش کرنے کی دعوت بھی دی ہے جو آج یورپ کی لائبریریوں اور عجائب گھروں کی زینت بنی ہوئی ہے۔ اس کا اظہار اقبال نے یوں کیا ہے:

مگر وہ علم کے موتی ، کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

علامہ اقبال کا پیغام یہ ہے کہ آج کی پاکستانی نوجوان نسل کو چاہیے کہ وہ اپنے آبا و اجداد کی اُس میراث کا ، جو ہماری تہذیب و تمدن ، علوم دینی و دنیوی اور اسلاف کے افکار و اقدار کا بہترین خزانہ ہے ، گہرا مطالعہ کرے۔ یہ ہمارے بزرگوں کے وہی افکار و اقدار ہیں جن کا مطالعہ کر کے آج اہلِ یورپ ترقی کے منازل طے کر رہے ہیں۔

طلوعِ اسلام:

علامہ کی نگاہ آج بھی اپنی مسلم نوجوان نسل پر لگی ہوئی ہے۔ اقبال کی روح آج بھی اس بات کی منتظر ہے کہ مصورِ پاکستان کی نوجوان نسل اپنے آبا و اجداد کی میراث حاصل کر کے آگے کب بڑھتی ہے اور آج کی دنیا کی دوڑ میں ترقی کے منازل طے کر کے دستار فضیلت کب اپنے سر پر رکھتی ہے۔ وہ آج بھی پاکستانی نوجوان نسل کو ''بانگ درا'' کی مشہور نظم ''طلوع اسلام'' میں پیامِ بیداری دے رہے ہیں:

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے

علامہ اقبال نے "طلوع اسلام" کا آغاز ہی "دلیل صبح روشن" سے اس طرح کیا ہے:

دلیلِ صبحِ روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب ابھرا، گیا دورِ گراں خوابی

علامہ اقبال کی نگاہ کو "عروقِ مردۂ مشرق" میں پھر سے خون زندگی دوڑتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ جس طرح تلاطم ہائے دریا سے گوہر کی سیرابی ہوتی ہے، اسی طرح اقبال کو آج کے مسلمان، طوفانِ مغرب کے طلاطم کی زد میں آ کر تھپیڑے کھاتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ علامہ اقبال کے عقیدے کے مطابق یہی ان کے گوہر کی سیرابی کا پیش خیمہ ہے۔ علامہ کی پیش گوئی ہے کہ طوفانِ مغرب کے تلاطم کی زد میں آنے کے بعد وہ وقت دور نہیں جبکہ مومن کو گاہِ حق سے وہی شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی اور نطقِ اعرابی حاصل ہوگا۔ ان تمام کیفیات کا اظہار علامہ اقبال نے اپنے من میں ڈوب کر "طلوعِ اسلام" کی نظم میں اس طرح کیا ہے:

عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی

ملتِ بیضا کی شیرازہ بندی :

علامہ اقبال کی دوربیں نگاہ نے آنے والے دور کی تصویر بخوبی دیکھ لی تھی۔ اُن کی چشمِ بینا یہ بھی جانتی تھی کہ اب چشمِ مسلم کی اشک ریزی میں ابرِ نیساں کا اثر پیدا ہو چکا ہے، اس لیے انھیں یقین تھا کہ اب خلیل اللہ کے دریا میں گوہر آبدار بھی پیدا ہوں گے۔ اُن کی آنکھ کو شاخِ ہاشمی سے برگ و بار پھر سے پھوٹتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اور انھیں کتابِ ملتِ بیضا کی پھر سے شیرازہ بندی ہوتی نظر آ رہی تھی، جس کا اظہار اُنھوں نے یوں کیا ہے :

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گُہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

علامہ اقبال رجائیت پسند تھے۔ اگرچہ انھیں اپنے زمانے میں شکستگی کا احساس ضرور تھا لیکن اس کے باوجود انھیں آنے والا زمانہ روشن اور درخشاں نظر آ رہا تھا، کیونکہ اُن کی چشمِ دل نے جگر خوں ہو کر یہ منظر خود دیکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آنے والے دور کی تصویر دیکھ کر پکار اُٹھتے ہیں کہ :

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

علامہ اقبال نے آنے والے دور کی روشن تصویر کی عکاسی یونہی خوش فہمی میں آ کر نہیں کی بلکہ اپنے چشمِ دل میں یہ نظر جگر خون کر کے حاصل کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظر میں جہانبانی سے کارِ جہاں بینی دشوار تر ہے، جس کے زیرِ اثر وہ اس حقیقت کا اظہار یوں کرتے ہیں :

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا
ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی، کہہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے

جب علامہ اقبال کو آنے والا دور روشن نظر آیا تو انھوں نے اپنے دور کے نوجوان مسلم کو پھر سے شیرازہ بندی کرنے کی دعوت دی۔ اس شیرازہ بندی کے لیے جو اقدامات ضروری تھے اُن کی طرف نہیں متوجہ کیا۔ مثلاً مسلمانوں کو رنگ و نسل اور حسب و نسب کے بتوں کو توڑ کر محض ملت اسلامیہ میں گم ہو جانے کی تلقین کی۔ پھر اتحادِ عالمِ اسلامی کے پیش نظر توران، ایران اور افغانستان کی قومی سرحدات کو توڑ کر ملتِ اسلامیہ کی حیثیت سے ایک ہونے کا پیغام یوں دیا :

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی ، نہ ایرانی ، نہ افغانی

یقینِ محکم :

علامہ اقبال اپنے دور کے ہندی مسلم نوجوان کو جانتے تھے کہ اس کا دل درد اور تڑپ سے خالی نہیں ، لہٰذا اقبال نے اس کے انگارۂ خاکی میں یقین پیدا کرنے کی دعوت دی اور فرمایا کہ :

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

پھر اپنے ہندی نوجوان مسلم کو ، جو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے ، بجائے شمشیر اور تدبیر سے جنگ کرنے کے سب سے پہلے اپنے اندر یقین پیدا کرنے کی تلقین کی اور انھیں واشگاف الفاظ میں یہ پیغام دیا کہ :

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

علاوہ ازیں ان مسلم نوجوانوں کو اپنی تقدیر بدلنے کے لیے اپنے اندر نگاہِ مردِ مومن کی تاثیر اور زور بازوئے حیدری پیدا کرنے کی یوں تلقین کی :

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زور بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یقینِ محکم پیدا کرنے کے لیے ان تمام لوازمات کا بھی ذکر کیا جس سے انسان کے دل میں یقینِ محکم پیدا ہو سکتا ہو۔ اقبال

نے رہنمائی کی کہ سب سے پہلے ہندی مسلم نوجوان کو دنیاوی خواہشات اور حرص و ہوا کو بالائے طاق رکھ کر آزادی کے لیے ایثار و قربانی دینا ہوگی۔ تمیزِ بندہ و آقا جس پر فسادِ آدمیت کی بنیاد ہے اُس کی بیخ کنی کرنا ہوگی۔ جب انکارۂ خاکی میں یقین پیدا ہو جائے اور ایثار و قربانی کا مقصد حاصل ہو اور محبت و اخوت کا جذبہ موجزن ہو تو پھر بالیقین یہی وہ ہتھیار ہیں جن کے ذریعے نہ صرف غلامی کی زنجیریں کٹ جاتی ہیں بلکہ جہادِ زندگانی میں یہ مردوں کی شمشیریں ثابت ہوتے ہیں، لہٰذا ہندی نوجوان مسلم کو محبت و اخوت، یقینِ محکم اور عملِ پیہم کا پیام ان الفاظ میں دیا:

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اور یہ بھی بتایا کہ تعمیرِ ملت کا سرمایہ یہی یقین محکم ہے اور یہی وہ قوت ہے جس سے ایک قوم کی تقدیر بنائی جا سکتی ہے لہٰذا فرمایا کہ:

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

پاکستانی نوجوان اور دنیائے اسلام:

علامہ اقبال کا کلام نہ صرف ہندی مسلم نوجوان کے لیے مشعل راہ تھا بلکہ آج بھی پاکستانی نوجوان مسلم کے لیے بالخصوص اور دنیائے اسلام کی نوجوان نسل کے لیے بالعموم ارتقائی منازل طے کرنے کے لیے از بس ضروری ہے۔ جس طرح علامہ اقبال کے پُر جوش

اور مؤثر کلام نے ہندی نوجوان مسلم کو گرما کر اسے غلامی کی آہنی زنجیروں سے آزاد کروایا ہے، اسی طرح علامہ اقبال کا کلام آج بھی حکیم ملت اور مفکرِ اسلام ہونے کی حیثیت سے نہ صرف پاکستانی نوجوان کے لیے بلکہ تمام دنیائے اسلام کے لیے شمع ہدایت ثابت ہو گا۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ حکیمِ ملت اور مفکرِ اسلام علامہ اقبال کی یہی وہ پیش گوئیاں ہیں جو حرف بہ حرف درست ثابت ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ حکیمِ ملت کی دوربین نگاہ کو آنے والے دور کی تصویر صاف دکھائی دے رہی تھی۔ چنانچہ ''بانگ درا'' میں ایک نظم بعنوان ''دنیائے اسلام'' کے آخر میں اس کا اظہار علامہ اقبال نے خود یوں کیا ہے:

کھول کر آنکھیں مرے آئینۂ گفتار میں
آنے والے دور کی دھندلی سی اک تصویر دیکھ

اور پھر یوں فرمایا کہ:

عام حرّیت کا جو دیکھا تھا خواب اسلام نے
اے مسلماں آج تو اس خواب کی تعبیر دیکھ

اسی نظم میں شاعرِ مشرق نے ایشیا کے مسلمانوں کو ''ربط و ضبطِ ملتِ بیضا'' کا یوں پیغام دیا ہے:

ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بےخبر
پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
مُلک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر

مفکرِ اسلام نے رسول مقبولؐ کے آخری حج کے موقع پر کہے جانے والے اس آخری پیغامِ الٰہی کی روشنی میں، جو خالقِ کل نے اپنے پیغمبرِ آخر الزمان کے توسل سے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ تمام نسلِ آدم کو بھیجا تھا، دنیائے اسلام کے تمام مسلمانوں کو یہ پیغام دیا ہے کہ:

جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں، مٹ جائے گا
ترکِ خرگاہی ہو، یا اعرابیِ والا گہر

اس کی تلقین یوں بھی کی کہ:

نسل اگر مسلم کی، مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو، مانندِ خاکِ رہ گزر

آخر میں دنیائے اسلام کی تمام نوجوان نسل کو جو آنے والے دور میں تمام دنیائے اسلام کا ستون ہو گی، پُر زور الفاظ میں یہ پیغام دیا ہے:

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب وجگر

اسلاف کا قلب و جگر ڈھونڈنے کے لیے حکیمِ ملت نے یہ پیغام دیا ہے:

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

آج کے تقاضے کے مطابق مفکرِ اسلام کا یہ پیغام نہ صرف نوجوان مسلم کے لیے بلکہ تمام دنیائے اسلام کے لیے مشعل راہ ثابت ہو گا۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

* * *

٦

اقبال ، گورنمنٹ کالج اور علامہ اقبال یونیورسٹی

لاہور کی تاریخی حیثیت :

یہ حسین و جمیل شہر جسے آج لاہور کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ، نہ صرف پاکستان کی ثقافت اور تہذیب و تمدن اور علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے ، بلکہ قدامت کے اعتبار سے دنیا کے قدیم ترین شہروں میں شمار کیا جاتا ہے۔

تاریخی شواہد کے مطابق شہر لاہور اس برصغیر پاک و ہند میں آریاؤں کی آمد سے پہلے سے آباد ہے۔ پاک و ہند کی قدیم تاریخ کے مورخین متفقہ طور پر بیان کرتے ہیں کہ لاہور کی قدامت دو ہزار سے چار ہزار قبل مسیح متعین کی جا سکتی ہے۔ سر جان مارشل[1] رقم طراز ہیں کہ موہنجو دڑو اور ہڑپہ کے دفینوں کی تحقیق سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ موہنجو دڑو سے لے کر ہڑپہ تک ، جس میں قدیم لاہور کا علاقہ بھی شامل ہے ، انسانی زندگی کا سراغ تین ہزار سال سے لے کر چار ہزار سال قبل مسیح یعنی آریاؤں کی آمد سے پہلے بھی ملتا ہے۔

---

1. "Yet this is what the discoveries at Harappa and Mohenjodaro have now placed beyond question, they exhibit the Indian People of the fourth and third Millennia B.C. possession of a high developed culture in which no vestige of Indo-Aryons influence is to be found." [Sir John Marshall : Mohenjodaro and Indus Civilization, London, 1931, Vol. I, Preface P.V.].

''انسائیکلو پیڈیا آف ایشنز'' کی اطلاع کے مطابق آریاؤں کی آمد ایک ہزار پانچ سو سال قبل مسیح ہے۔

ہندو راج کے بعد غزنوی دور میں مسلمانوں کی سلطنت کا سب سے پہلا باقاعدہ پایۂ تخت یہی شہر لاہور بنا۔ ''تاریخ بیہق'' کے مصنف ابو الحسنؒ ابن فندق کے بیان کے مطابق غزنویوں کا پایۂ تخت خراسان اور عراق سے منقطع ہو کر سنہ ۴۲۸ ہجری میں لاہور مقرر کیا گیا۔ یہ زمانہ امیر مسعود (اوّل) بن محمود غزنوی کا ہے۔ پھر مسعود (سوم) بن ابراہیم غزنوی کے زمانے (۴۹۲ھ تا ۵۰۸ھ) میں یہی شہر لاہور اسلامی تہذیب و تمدن اور علم و ادب کا بےمثال گہورا بن گیا۔ حضرت داتا گنج بخش سید علی ہجویری کا زمانہ بھی یہی تھا۔ اس شہر لاہور میں ''دارالکتب'' کے نام سے اتنی بڑی لائبریری موجود تھی جس میں دنیا بھر کے کتاب خانوں سے کتابیں اکٹھی کرکے لائی گئی تھیں۔ اس کی تصدیق ہمیں اس دور کے مشہور شاعر مسعود سعد سلمانؒ لاہوری کے ان اشعار سے ہوتی ہے :

---

1. "About 1500 B.C. Aryans being pouring through the Kheybar Pass in quest of the bush plains of Hindustan." [James T. Shotwell and others : Enseyclopaedia of Nations, New York, P. 449.]

۲۔ ''ملک ایشاں (محمودیان) از دیار خراسان و عراق منقطع گشت وبا غزنی افتاد فی شہور ثمان و عشرین و اربعمایہ (۴۲۸ھ) و از غزنین منقطع شدہ است و با دیار لوہاوور (لاہور) و برشاوور (پشاور) و آن طرف افتادہ۔''

(ابو الحسن علی ابن فندق — تاریخ بیہق — باہتمام عبدالوہاب قزوینی تہران، ۱۳۰۸ھ ص مقدمہ سیج)۔

۳۔ مسعود سعد سلمان لاہوری : دیوانِ مسعود سلمان — (بتصحیح آقای رشید یاسمی) تہران چاپ کتاب فروشی ادب ۱۳۱۸خ، ص ۲۲۳ - ۲۲۴۔

حوالہ ثانی : دکتر یمین خان لاہوری : ''تاریخ شعر فارسی در لاہور'' — باہتمام ''پاکستان سنٹرل کمیٹی۔ ناشر : نیشنل پبلشنگ ہاؤس کراچی، چاپ غلام علی پبلشرز ۱۰ ہسپتال روڈ لاہور، اکتوبر ۱۹۷۷ع، ص ۵۷ - ۵۸۔

در مدح سلطان مسعود بن ابراہیم غزنوی :

دہد ہر علم را نظمی کہ ہر کس بود از علم نوعی را خریدار
کند مشحون ہر طاق و رف آن بتفسیر و باخبار و باشعار
بیاراید کنون دارالکتب را بتوفیق خدای فرد جبّار
زہر دارالکتب کاندر جہانست چنان سازد کہ پیش آید بمقدار

تاریخی شواہد سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ غزنوی دور کے بعد سلاطین دہلی کے زمانے میں بھی لاہور علم و ادب کا گہوارہ بنا رہا یعنی غوری ، خلجی ، لودھی اور سلطنت مغلیہ کے آخر تک اور پھر برطانوی دور سے لے کر قیام پاکستان کے بعد آج بھی شہر لاہور علم و ادب کا گہوارہ بنا ہوا ہے۔ برطانوی دور میں جو سب سے پہلا مرکزی اور معیاری تعلیمی ادارہ (گورنمنٹ کالج) قائم ہوا وہ بھی لاہور میں ہے۔

گورنمنٹ کالج لاہور کی تاریخی ، علمی اور ادبی حیثیت :

جس طرح لاہور پاکستان کا دل کہلاتا ہے اسی طرح گورنمنٹ کالج لاہور علمی ، ادبی اور تدریسی اعتبار سے لاہور کے سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل ہے ۔ گورنمنٹ کالج لاہور کا ٹاور ایک سو برس گزرنے کے بعد آج بھی اس بات کا متلاشی ہے کہ اس ادارے میں پھر سے کوئی اقبال جیسی شخصیت آئے جو پاکستانی قوم و ملت کی رہنمائی کر سکے۔ یہ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ یہ عظیم درس گاہ ، جو ایک سو برس کی قدامت کے باوجود بفضلہ تعالیٰ قائم و دائم ہے ، اقبال کے نام پر "علامہ اقبال یونیورسٹی" کی صورت میں جلوہ گر ہوا ، جو کہ اب خدا کے فضل سے اسلام آباد میں قائم کی جا چکی ہے ۔

جس طرح شہر لاہور کی قدیم تاریخ موجود ہے اسی طرح گورنمنٹ کالج لاہور کی بھی ایک مکمل تاریخ لکھی جا چکی ہے جس کا سہرا کالج میں تاریخ کے سابق پروفیسر مسٹر گیرٹ کے سر پر ہے۔ مسٹر گیرٹ نے ۱۸۸۴ء سے لے کر ۱۹۱۴ء تک کے واقعات اور حقائق پر مشتمل گورنمنٹ کالج کی تاریخ بعنوان "A History of Govt. College, Lahore" مرتب کی ہے۔

اس کے بعد جناب پروفیسر عبدالحمید (مرحوم) سابق صدر شعبہ تاریخ گورنمنٹ کالج لاہور نے اس تاریخ کا دوسرا حصہ (سنہ ۱۹۳۴ء سے لے کر ۱۹۶۴ء تک) گورنمنٹ کالج لاہور کے جشن صد سالہ کے موقع پر شائع کیا۔ مذکورہ تاریخ جو حقایق کے اعتبار سے مدلل اور مستند ہے، اس بات کی شاہد ہے کہ گورنمنٹ کالج لاہور گذشتہ ایک سو برس سے لاہور کی ایک عظیم درسگاہ رہا ہے۔ اس کا قیام یکم جنوری ۱۸۶۴ء کو عمل میں آیا۔ اس کے سب سے پہلے پرنسپل جناب ڈاکٹر لائٹنر مقرر کیے گئے جو برطانوی مستشرقین میں سے تھے اور اس سے پہلے کنگز کالج لندن میں عربی اور محمڈن لاء کے پروفیسر تھے۔ اس کی تصدیق ہمیں گورنمنٹ کالج لاہور کی تاریخ[1] سے ہوتی ہے۔

---

1. (a) "The College was opened on January 1st, 1864, under the sanction given by His Honour the Lieutenant-Governor, to the Establishment provided for it in the budget of 1883." (p 1)

   (b) "Alongside of the establishment of the College, Dr. G.W. Leitner of the Freiburg University, who was then Professor of Arabic and Mohammedan Law at Kings College London, was nominated as Principal"—. (P 1)

پورے ایک سو سال بعد گورنمنٹ کالج لاہور کی تاریخ نے پھر ایک کروٹ لی، یعنی ۱۹۶۴ء کو جشن صد سالہ گورنمنٹ کالج لاہور کے بعد، علامہ اقبال کی اس درس گاہ کو "علامہ اقبال یونیورسٹی" بنانے کی تحریک پورے جوش و خروش سے شروع ہوئی۔

پنجاب یونیورسٹی کا بانی گورنمنٹ کالج لاہور:

اگر ہم گورنمنٹ کالج لاہور کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ یہ گورنمنٹ کالج لاہور ہی تھا جس نے پنجاب یونیورسٹی کی بنیاد رکھنے میں مثالی کردار ادا کیا۔

تاریخ[1] بتاتی ہے کہ گورنمنٹ کالج لاہور کے مذکورہ پہلے پرنسپل نے سنہ ۱۸۷۰ء میں پنجاب میں ایک یورنیورسٹی قائم کرنے کی تحریک چلائی جو پہلے تو ناکام رہی لیکن بعد میں مسلسل کوششوں کے بعد سنہ ۱۸۸۲ء میں یونیورسٹی کا قیام معرض وجود میں آیا۔

اُس وقت سے لے کر اب تک گورنمنٹ کالج لاہور کے اساتذہ، پنجاب یونیورسٹی کے سب سے قدیم کالج میں، جس کا نام آج یونیورسٹی اورینٹل کالج ہے، یونیورسٹی کے متعلقہ عملے کے دوش بدوش تعلیم

---

1 (a) "A movement was therefore initiated for the establishment of a University in the Panjab and the first step was the establishment, in 1870, of a Panjab University College, to which the existing College were to be affiliated"—(P. 12)

(b) "The year (1881—82) under review is the eve of that great event in the annals of the Panjab the establishment of the Panjab University—" (P. 45)

(H.L.Q. Garrett & Abdul Hamid——A History of Govt. College, Lahore—1864—1964).

دیتے رہے ہیں۔ اس روایت کا آغاز بھی گورنمنٹ کالج کے پہلے پرنسپل ڈاکٹر لائٹنر نے ہی کیا تھا۔

مذکورہ تاریخی شواہد سے یہ بھی ثابت ہوا کہ گورنمنٹ کالج لاہور تدریسی میدان میں گذشتہ ایک سو برس سے پنجاب یونیورسٹی کی رہنمائی کرتا چلا آ رہا ہے۔ اس کے اساتذہ میں ڈاکٹر لائٹنر کے علاوہ بین الاقوامی شہرت یافتہ اور فلسفے کے استاد پروفیسر آرنلڈ، پھر اُن کے شاگردِ رشید گورنمنٹ کالج لاہور کے استاد ڈاکٹر محمد اقبال بھی شامل رہے ہیں، جو بعد میں فکری جلا حاصل کر کے مفکرِ پاکستان کے نام سے یاد کیے جانے لگے، یعنی علامہ اقبال کی شخصیت بھی گورنمنٹ کالج لاہور نے ہی پیدا کی۔ اُن کے علاوہ محمد حسین آزاد، پطرس بخاری، قاضی فضل حق، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور بہت سے دیگر اساتذہ کے اسمائے گرامی لیے جا سکتے ہیں۔

علامہ اقبال اور گورنمنٹ کالج لاہور (۱۹۰۲ء تا ۱۹۰۸ء):

گورنمنٹ کالج لاہور کی تاریخ جلد دوم کے مؤرخ جناب پروفیسر عبدالحمید[1] کی تحقیق کے مطابق گورنمنٹ کالج لاہور میں علامہ اقبال کی پہلی تقرری بحیثیت ایڈیشنل پروفیسر شعبہ انگریزی فقط چھ ماہ کے لیے سنہ ۱۹۰۲ء میں ہوئی۔ تین سال[2] بعد یعنی ۱۹۰۵ء میں علامہ اقبال ترقی پا کر فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر کیے گئے

---

1. (a) In 1902—Sheikh Muhammad Iqbal was appointed additional Professor of English for a Period of six months". (P. 112)
2. "In 1905—Sheikh Muhammad Iqbal M.A, Assistant Professor of Philosophy, was granted extraordinary Leave for three years to study in England." (P. 112)

لیکن ساتھ ہی اسی سال یعنی ۱۹۰۵ء میں تین سال کے لیے لندن تشریف لے گئے۔

پھر تین سال[1] بعد جب آپ لندن سے واپس تشریف لائے تو آپ نے استعفیٰ دے دیا۔

مذکورہ تاریخی شواہد کے مطابق علامہ اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور سے سنہ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۸ء تک بطور استاد رابطہ رکھا۔ ۱۹۰۲ء سے ۱۹۰۵ء تک بطور اسسٹنٹ پروفیسر اپنے فرائض انجام دیے اور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک رخصت پر تین سال یورپ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور واپسی پر اسی سال استعفیٰ دے دیا۔

اسی زمانے میں علامہ اقبال کی شہرت کا آغاز ہوتا ہے۔ یہی وہ گورنمنٹ کالج لاہور کا ادارہ ہے جس میں انھیں پروفیسر آرنلڈ جیسے فلسفی استاد نصیب ہوئے اور اُن کے ذہن نے جلا حاصل کی۔ جب یورپ سے اعلیٰ تعلیم کے بعد واپس تشریف لائے تو مشرق و مغرب کے فلسفوں سے واقف ہو چکے تھے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے وہ تصانیف تخلیق کیں جن کی وجہ سے وہ ایک قوم کے رہنما بن گئے۔

---

1. "In 1908—" Sheikh Nur Elahi, M.A. was confirmed as Assistant Professor of Philosophy, Vice Sheikh Muhammad Iqbal, who resigned." (P. 114)
(Mr. H.L.Q. Garrett—and Abdul Hamid : "A History of Government College, Lahore," (1864—196)
Published by Dr. Nazir Ahmad, Principal Govt. College, Lahore, Printed in "Ripon Printing Press Ltd. Bull Road, Lahore, 1964—P. 112—114)

گورنمنٹ کالج میں اقبال ہوسٹل کا قیام (۱۸۹۸ع) :

گورنمنٹ کالج لاہور سے علامہ اقبال کی وابستگی صرف اسی زمانے تک نہیں رہی ، بلکہ آج بھی قائم ہے' اور انشاء اللہ العزیز آئندہ بھی قائم رہے گی ۔ تاریخی شواہد کے مطابق ، گورنمنٹ کالج کے قدیم ہوسٹل کا پرانا نام ''کواڈرینگل'' تھا ۔ اس کی قدیم عمارت آج بھی اسی طرح قائم ہے ۔ تاریخی حوالے کے مطابق اس کی عمارت ۱۸۹۸ع میں قائم ہوئی ۔ اس وقت اس کی صورت تین پہلوؤں پر مشتمل تھی ۔ اس کا دروازہ شمال کی طرف کھلتا تھا ، کوئی ڈرائینگ روم بھی نہ تھا ، باتھ رومز کچن کے قریب تھے ۔

سنہ ۱۹۶۵ع میں یہی پرانا ہوسٹل "اقبال ہوسٹل" کے نام سے موسوم ہوا ۔ اس میں اب محض ایف ۔ اے سال اوّل اور دوم کے طلبا رہتے ہیں ۔ علامہ اقبال کے طالب علمی کے چند سال اسی ہوسٹل کے ایک کمرے میں بسر ہوئے ۔ اُن کی رہائش کا کمرہ آج ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے ۔ ایک طالب علم کے لیے اس کمرے میں رہنا بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا ہے ۔ کالج قوانین کے مطابق اس کمرے میں ایم ۔ اے کے سب سے سینئر طالب علم کو رہنے کا اعزاز عطا کیا جاتا ہے جو "پریفکٹ اقبال ہوسٹل" کہلاتا ہے ۔ اقبال ہوسٹل کے اس تاریخی کمرے پر آثار قدیمہ کی طرف سے سنگ مرمر کی ایک تختی بھی لگائی گئی ہے ، جس پر یہ عبارت کندہ ہے :

"اس ہوسٹل میں اقبال طالب علمی کے زمانے میں
۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۵ء تک مقیم رہے۔
محکمہ آثار قدیمہ"

گورنمنٹ کالج لاہور میں علامہ اقبال کا طالب علمی کا زمانہ:

تاریخی شواہد سے معلوم ہوتا ہے گورنمنٹ کالج لاہور میں علامہ اقبال کا طالب علمی کا زمانہ سنہ ۱۸۹۵ء تک رہا۔

مجلس اقبال گورنمنٹ کالج لاہور (۱۹۳۸ء):

گورنمنٹ[1] کالج لاہور کی تاریخ میں "مجلسِ اقبال" کا قیام پہلی مرتبہ سنہ ۱۹۳۸ء میں علامہ اقبال کے انتقال کے فوراً بعد عمل میں آیا۔ اس سے پہلے گورنمنٹ کالج میں ایک ادبی محفل بعنوان "اردو مجلس" معرضِ وجود میں آ چکی تھی، جس میں ہر ہفتے نظمیں، ڈرامے اور مختصر کہانیاں اردو میں پیش کی جاتی تھیں اور ان پر بحث ہوتی تھی۔ سنہ ۱۹۳۸ء میں علامہ اقبال کی وفات کے بعد گورنمنٹ کالج کی اسی "اردو مجلس" کا نام علامہ اقبال کے نام پر "مجلسِ اقبال"

---

1. "On Iqbal's death in 1938, the Majlis was re-named "Majlis-i-Iqbal" and its first meeting, under the changed name, was inaugurated by M.D. Taseer. The Majlis was the first College Society to attract women students to its meetings"—

[H.L.Q. Garrett & Abdul Hamid—A History of Govt. College, Lahore (1864—1964)—Ripon Printing Press, Lahore. 1964—P. 223.

رکھا گیا۔ اس طرح ''مجلسِ اقبال'' کا قیام عمل میں آ گیا۔ مذکورہ ''مجلس اقبال'' کی سب سے پہلی میٹنگ کا انعقاد سنہ ۱۹۳۸ء میں جناب ایم۔ ڈی۔ تاثیر نے کیا۔ ''مجلسِ اقبال'' گورنمنٹ کالج کی پہلی سوسائٹی تھی جس نے پہلی بار طالبات کو بھی شرکت کرنے کے لیے متوجہ کیا۔

آج بھی ''مجلسِ اقبال'' روایت کے مطابق مسلسل ہفتہ وار ادبی اور تنقیدی اجلاس منعقد کرتی رہتی ہے۔ علاوہ ازیں گزشتہ کئی برسوں سے تقریباً ہر سال علامہ اقبال کی برسی کے موقع پر گورنمنٹ کالج لاہور کے معروف تاریخی مجلہ ''راوی'' کے ''اقبال نمبر'' بھی شائع ہوتے رہتے ہیں، جسے ''مجلس اقبال'' شائع کرتی ہے۔

بالخصوص ''جشنِ صد سالہ علامہ اقبال'' کے موقع پر نومبر ۱۹۷۷ء کو ''راوی'' کا ایک خاص شمارہ بعنوان ''اقبال نمبر'' بھی شائع ہوا۔ اس کے علاوہ گورنمنٹ کالج لاہور کے تقریباً تمام شعبوں مثلاً شعبۂ تاریخ، شعبۂ فلسفہ، شعبۂ نفسیات، شعبۂ فارسی اور شعبۂ انگریزی نے اس موقع پر کئی خاص ''اقبال نمبر'' شائع کیے۔ اسی طرح ''اقبال ہوسٹل'' کی جانب سے بھی ایک خاص شمارہ بعنوان ''اقبال نمبر'' شائع کیا گیا۔

علامہ اقبال یونیورسٹی کا قیام:

گورنمنٹ کالج لاہور سے علامہ اقبال کی وابستگی ایک صدی سے آج بھی قائم و دائم ہے۔ بالفاظ دیگر اگر علامہ اقبال نے اس ادارے سے جلا حاصل کی تو اقبال بنے۔ جب اقبال کی شخصیت ابھر کر سامنے آئی تو گورنمنٹ کالج لاہور کی اہمیت بھی بڑھی، لہٰذا اس اعتبار

سے گورنمنٹ کالج لاہور اور علامہ اقبال دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں، لہٰذا اس کے پیش نظر علامہ اقبال یونیورسٹی کا قیام اسی ادارے کو زیب دیتا تھا۔ بہرحال جس طرح اس کا ماضی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے، اسی طرح اس کا مستقبل بھی روشن و درخشان دکھائی دیتا ہے۔

علامہ اقبال کی مناسبت سے گورنمنٹ کالج لاہور نے، جو علامہ کا مادر علمی رہا ہے، چند سال پیشتر گورنمنٹ کالج لاہور کو گورنمنٹ کالج یونیورسٹی کا درجہ دینے کا مطالبہ کیا تھا۔ سنہ ۱۹۷۶ء میں حکومتِ پاکستان کی طرف سے یہ بھی اعلان کیا گیا تھا کہ ۱۹۷۷ء کو "جشنِ صد سالۂ اقبال" کے موقع پر گورنمنٹ کالج لاہور کو "علامہ اقبال یونیورسٹی بنا دیا جائے گا۔ اس پر گورنمنٹ کالج لاہور کے اساتذہ اور اولڈ راوینز نے بھرپور اجلاس منعقد کیے اور تحریری طور پر بھی اس مسئلے کو اخبارات کے ذریعے عوام اور حکومت تک پہنچایا۔

اس زمانے میں راقم الحروف گورنمنٹ کالج لاہور کے مذاف سیکرٹری کے حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہا تھا، لہٰذا اس موقع پر راقم الحروف کے مندرجہ ذیل مضامین بھی شائع ہوئے۔ تفصیل حاصل کرنے کے لیے جن کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے:

۱۔ گورنمنٹ کالج لاہور اور علامہ اقبال یونیورسٹی (نوائے وقت لاہور، ۲۰ ستمبر ۱۹۷۷ء)۔

۲۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے علامہ اقبال یونیورسٹی تک (پہلی قسط) (آزاد لاہور، ۲۲ ستمبر ۱۹۷۷ء)۔

۳۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے علامہ اقبال یونیورسٹی تک (دوسری قسط) آزاد لاہور، ۲۳ ستمبر ۱۹۷۷ء۔

۴۔ لاہور گورنمنٹ کالج اور اقبال یونیورسٹی (مساوات، لاہور، ۳۰ ستمبر ۱۹۷۷ء۔

۵۔ اقبال، اور علامہ اقبال یونیورسٹی (نوائے وقت لاہور، ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۷ء)۔

۶۔ گورنمنٹ کالج لاہور ایک قدیمی درس گاہ کی تاریخ (نوائے وقت، لاہور، جمعرات، ۲۰ اپریل ۱۹۷۸ء)۔

بعد ازاں گورنمنٹ کالج لاہور کی دیکھا دیکھی کچھ اور اداروں نے بھی اسے اپنا مسئلہ بنا لیا۔ اس ضمن میں ایک آواز سیالکوٹ سے اٹھی کہ سیالکوٹ میں علامہ اقبال یونیورسٹی قائم کی جائے۔ دوسری طرف سے اسلامیہ کالج لاہور کو اقبال یونیورسٹی بنانے کا مطالبہ کیا گیا۔ تیسری تجویز یہ بھی سامنے آئی کہ پنجاب یونیورسٹی ہی کو علامہ اقبال یونیورسٹی کا نام دے دیا جائے۔

مندرجہ بالا حالات اور مطالبات کے پیش نظر حکومت پاکستان نے "علامہ اقبال یونیورسٹی"، پاکستان کے مرکز اسلام آباد میں قائم کردی۔

اس طرح "علامہ اقبال یونیورسٹی" کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد نظریۂ پاکستان، احیائے اقدارِ اسلامی اور اقبالیات کے موضوعات کو ملک کے تمام گوشوں میں پھیلانا ہے۔ امید ہے کہ اس ادارے سے نہ صرف پاکستان میں بلکہ تمام دنیائے اسلام میں اقبالیات

کے زیر اثر فکرِ اسلامی کا ایک نیا سورج طلوع ہو گا، جس کی روشنی سے یہ چمن نغمۂ توحید سے معمور ہو جائے گا۔ پھر مصور پاکستان اور مفکرِ اسلام علامہ اقبال کی یہ پیش گوئی اس طرح عملی جامہ پہنے دکھائی دے گی:

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

گورنمنٹ کالج لاہور بحیثیت مشعل اقبال:

یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں نظر آتی ہے کہ گورنمنٹ کالج لاہور، علامہ اقبال کی ایک ایسی مشعلِ علم ہے جو علم کی روشنی ہمیشہ پھیلاتی رہے گی۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں علامہ اقبال کے نام پر ''مجلس اقبال'' اور ''اقبال ہوسٹل'' کا قیام اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ گورنمنٹ کالج لاہور سے کئی اور مشعلیں روشن ہوں گی۔

* * *

۷

اقبال ایران کی نظر میں

قیامِ پاکستان سے پہلے ہی اقبال کا نام ملکی حدود کو عبور کر کے دنیائے ادب کی آخری سرحدوں تک جا پہنچا تھا۔ اس کے متعلق ہر ملک اور زبان میں بہت کچھ لکھا جا چکا تھا اور لکھا جا رہا ہے۔ وہ ایک سیاسی مفکر ہی نہیں بلکہ ایک فلسفی شاعر کی حیثیت سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ دنیائے اسلام میں اسے شاعر ملی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ خود اس کی قوم اسے حکیمِ ملت کہنا باعث افتخار سمجھتی ہے۔ اگرچہ وہ کشورِ ایران کی سر زمین میں نہیں پلا لیکن اہلِ ایران بھی اسے اپنا شاعر کہہ کر فخر محسوس کرتے ہیں۔

جب ایک ایرانی اقبال کو سمجھنا چاہتا ہے تو اس کے سامنے اقبال کا فارسی کلام ہوتا ہے جو اس کے تمام فلسفے کی نمائندگی کرتا ہے لہٰذا جب کوئی ایرانی دانشور اقبال کے کلام کو حقیقت بیں نگاہ سے پرکھتا ہے تو عجیب بات یہ ہے کہ اقبال اسے اپنا ہی شاعر محسوس ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اقبال کے فارسی کلام کی زبان وہی زبان ہے جسے سب سے پہلے رودکی اور فردوسی نے اپنایا۔ پھر مرشدِ رومی نے اس کی آبیاری کی یہاں تک کہ خطۂ شیراز کے سعدی شیرازی کی گلستان و بوستان میں مہکی۔ پھر حافظ شیرازی کی لے میں نغمہ سرا ہوکر پاک و ہند کے آخری گوشۂ بنگال تک جاپہنچی جس کے متعلق خود حافظِ شیریں سخن نے یوں فرمایا ہے :

شکر شکن شوند ہمہ طوطیان ہند[1]
زین قند پارسی کہ بہ بنگالہ میرود

اقبال نے فارسی زبان کو اپنے کلام میں اسی طرز سے اپنایا جس طرح ایک ایرانی شاعر اسے اپناتا ہے ۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا اظہار ہر دانشور ایرانی خوشی سے کرتا ہے ۔ مثلاً ایران حاضر کے مشہور ادیب آقای کاظم رجوی اس نظریے کو ان الفاظ میں یوں بیان کرتے ہیں :

"این شاعرِ پارسی گوئی زبان ایرانی را تنہا وسیلہ شائیستہ برای بیانِ اندیشہ ها واحساسات خود داشت ۔"[2]

یعنی اقبال نے اپنے احساسات اور افکار کے اظہار کے لیے ایرانی فارسی زبان کو اپنا وسیلہ اظہار بنایا ہے ۔ اسی طرح ایران کے ایک اور محقق ادیب داؤد شیرازی کلیات اقبال کے مقدمے میں اقبال کی شاعری کے متعلق فرماتے ہیں کہ اگرچہ پاک و ہند کی تاریخ ادبیات میں بے شمار فارسی گو شعرا پیدا ہوئے ہیں اور ان میں سے قادرالکلام شعراء بھی ہیں لیکن اقبال کی فارسی شاعری کا انداز سب سے جداگانہ ہے ۔

جناب آقای داؤد شیرازی تو علامہ اقبال کو نہ صرف ایک ایرانی اندازِ فکر کا شاعر سمجھتے ہیں ۔ بلکہ ان کا عقیدہ ہے کہ

---

۱ ۔ شمس الدین محمد حافظ شیرازی ، دیوان حافظ شیرازی ، انتشارات انجمن خوش نویسانِ ایران ، چاپخانہ آفست ، سہامی عام ، پائیز ۱۳۴۳خ ، ص ۱۷۴ ۔
۲ ۔ کاظم رجوی ۔

اقبال نے عصرِ حاضر کی جدید فارسی شاعری میں ایک نئے اسلوبِ بیان کی بنیاد رکھی ہے، اور حق تو یہ ہے کہ اس اسلوبِ بیان کو "سبکِ اقبال" کے نام سے یاد کرنا چاہیے اور آج کے ادبی دور کو اقبال کے نامِ نامی ہی سے پکارا جانا چاہیے - یہاں میں جناب آقای داؤد شیرازی کے الفاظ پیش کرتا ہوں :

"اقبال سبک و مکتب جدیدی در شعر فارسی تاسیس کردہ کہ حقاً باید سبک او را "سبک اقبال" نامید و قرن ادبی حاضر را باید بنامِ نامی او مزین ساخت -"[1]

حقیقت یوں ہے کہ جب ایک ایرانی محقق دانشور کی نگاہ اقبال کے اس شعر پر پڑتی ہے کہ :

تنم گلی ز خیابان جنت کشمیر
دل از حریم حجاز و نوا ز شیراز است[2]

تو وہ اقبال کے اس دعوے کو کہ اس کی نوای شعر فارسی، نوائے شیرازی ہے، یونہی قبول نہیں کرتا بلکہ اس کے کلام کا بنظر عمیق مطالعہ کرتا ہے تو اسے اقبال کے کلام میں نہ صرف ایرانی تشبیہات و استعارات بلکہ تلمیحات اور یہاں تک کہ ایرانی مقامی اشارات بھی ملتے ہیں - مثلاً اقبال کی مشہور نظم "مرودِ انجم" کا یہ بند ملاحظہ ہو :

---

۱ - داؤد شیرازی : مقدمہ ناشر، کلیات اقبال لاہوری، بوسیلہ احمد سروش، کتابخانہ سنائی، تہران، ۱۳۴۳ھ، مقدمہ ص ۱ -
۲ - علامہ اقبال : پیام مشرق، چاپ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور، ۱۹۶۹ع، "منے باقی"، ص ۲۱۴ -

خواجہ ز سروری گزشت بندہ ز چاکری گذشت
زاری و قیصری گزشت دور سکندری گذشت
شیوۂ بتگری گذشت سی نگریم و سی رویم[1]

اوپر کے بند میں ''چاکری'' خالص ایران کے عصر حاضر کی زبان کا لفظ ہے اور ''دورِ سکندری'' ایران کا ایک ایسا پولٹیکل سمبل (Political Symbol) یعنی سیاسی علامت ہے جسے ہر ایرانی بآسانی سمجھتا ہے۔ اسی طرح پیام مشرق کے آغاز میں امان اللہ خان شاہ افغانستان سے خطاب کرتے ہوئے اقبال اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ اُن کے مندرجہ ذیل چند اشعار ملاحظہ ہوں :

کشورِ محکم شناسی بایدت
دیدۂ مردم شناسی بایدت

در قبای خسروی درویش زی
دیدۂ بیدار خود اندیش زی

ہم فقیری ہم شہ گردوں فری
اردشیری و روانِ بوذری

آں مسلمانان کہ میری کردہ اند
در شہنشاہی فقیری کردہ اند

در امارت فقر را افزودہ اند
مثل سلمان در مدائن بودہ اند

من شکوہ خسروی او را دہم
تختِ کسریٰ زیر پای او نہم[2]

---

۱ - اقبال لاہوری : پیام مشرق ، چاپ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور۔ ۱۹۶۹ء ، ص ۱۱۲ــ۱۱۴ -
۲ - ایضاً ، ص ۳ ، ۶ ، ۷ ، ۸ -

مندرجہ بالا اشعار میں ''کشور'' خالص پارسی زبان کا لفظ ہے جو آج بھی ایران حاضر کی فارسی زبان میں کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے ۔ پھر ''دیدۂ مردم شناسی'' ، ''شہِ گردون فری'' ، ''شکوہِ خسروی'' خالص ایرانی فارسی تراکیب ہیں ۔ اسی طرح ''قبای خسروی'' ، ''تختِ کسریٰ'' ، ''ارد شیری'' اور ''مسلمان در مدائن'' کی تلمیحات اور Local References یعنی مقامی اشارات خالص ایرانی فرہنگ و فکر اور تہذیب و تمدن کی نمائندگی کرتے ہیں ۔ یہی وہ اشارات و علامات ہیں جن کی وجہ سے گمان ہونے لگتا ہے کہ یہ اشعار کسی ایرانی شاعر کی تخلیق ہیں اور ایران کا رہنے والا قاری اس سے قطعاً اجنبیت محسوس نہیں کرتا بلکہ وہ اسے ایران سر زمین کا شاعر تصور کرتا ہے ۔

خود اقبال نے اپنی ہندی یعنی اردو زبان جس میں عزوبت اور شیرینی بھی موجود ہے ، چھوڑ کر گفتار دری کی طرز کیوں اختیار کی ؟ اس کا جواب خود اقبال تمہیدِ اسرار خودی میں یوں دیتے ہیں :

گرچہ ہندی در عزوبت شکّر است
طرزِ گفتارِ دری شیرین تر است[1]

بات دراصل یوں ہے کہ اقبال طبعاً فلسفی تھے اور وہ فلسفیانہ افکار کو دوسروں تک پہنچانا چاہتے تھے ، لہذا انھوں نے فلسفیانہ افکار کے ابلاغ کے لیے پارسی زبان کو ہی منتخب کیا کیونکہ ان کی نگاہ میں ابلاغ کا یہی ذریعہ بہتر تھا ۔ جب فلسفۂ خودی کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں اقبال نے شناوری کی تو جواہر نکال لائے ۔ جب

---

۱ ۔ اقبال : اسرار و رموز ، چاپ شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور ، ۱۹۶۴ء ، ص ۱۱ ۔

انھوں نے پیرِ رومی کے افکار کا مطالعہ زبانِ پہلوی میں کیا تو پہلوی زبان ، ذہنِ اقبال پر اس شدت سے اثر انداز ہوئی کہ انھوں نے زبانِ پہلوی میں ہی سوچنا شروع کیا ۔ پھر فکرِ اقبال پیرِ رومی کے جلوے سے اتنا مسحور ہوا کہ ان کا قلم شاخِ نخلِ طور بن گیا اور جب رفعتِ فکر میں پارسی اس طرح گھل مل گئی تو ان کے اندازِ فکر کی فطرت بن گئی جس کا دعویٰ خود اقبال نے ''اسرار خودی'' میں یوں کیا :

فکرِ من از جلوہ اش مسحور گشت
خامۂ من شاخِ نخلِ طور گشت
پارسی از رفعتِ اندیشہ ام
در خورد با فطرتِ اندیشہ ام[1]

جب اقبال ایرانی ماحول میں گم ہو کر اہلِ ایران سے حب الوطنی کا اظہار کرنے لگتے ہیں تو شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ مفکرِ عظیم سرزمین ایران کی ہی پیداوار ہے ۔ مثال کے طور پر جب ایران کا بہت بڑا مفکر اور محبِ وطن شاعر فردوسی جذبۂ احیای وطن میں ڈوب کر یوں کہتا ہے کہ :

بسی رنج بردم دربن سال سی
عجم زندہ کردم بدین پارسی[2]

تو وہ اس کا اپنا ماحول تھا ۔ وہ ایرانی النسل اور ایران کی پیداوار تھا ۔ لیکن اگر ہم تھوڑی دیر کے لیے بھول جائیں کہ اقبال نہ جانے

---

۱ ۔ ایضاً اسرار خودی ، ص ۱۱ ۔
۲ ۔ فردوسی طوسی : شاہنامہ ، چاپ بروخیم ، تہران ۔

کس سر زمین کا شاعر ہے اور پھر اس کا یہ شعر پڑھیں کہ :

عجم از نغمہ ہای من جوان شد
ز سودایم متاع او گران شد[1]

تو بالیقین ہم یہ کہیں گے کہ کوئی محب الوطن ایرانی شاعر ہے ، جس نے فردوسی کے بعد اپنے نغمہ ہائے فارسی سے عجم یعنی ایران کو پھر سے زندہ کیا ہے ۔ اسی طرح جب جوانانِ عجم کو "جانِ من ، جان شما" کہہ کر اقبال نے ان سے یوں خطاب کیا کہ :

چون چراغ لالہ سوزم در خیابان شما
ای جوانانِ عجم جانِ من و جان شما[2]

تو ان کی ایران دوستی کا شدید احساس ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ہر ایرانی اقبال کو اپنا شاعر کہہ کر فخر محسوس کرتا ہے ۔

ایران حاضر کے محققین میں سے نہ صرف جناب آقای داؤد شیرازی بلکہ دیگر اقبال شناس محققین کے نزدیک بھی اس بر صغیر پاک و ہند کے تمام فارسی شعرا میں سے ابو عبداللہ روزبہ الکنتی لاہوری اور مسعود سلمان لاہوری سے لے کر حضرت امیر خسرو دہلوی تک اور پھر عراقی ، نظیری اور فیضی فیاضی سے لے کر شاہ ابو المعالی اور ملا منیر لاہوری تک ، پھر غالب اور حالی سے لے کر اقبال تک جو شاعر ان کے قریب تر ہے اور جس کے سبکِ شعرِ فارسی کو وہ ایران کے سبکِ شعرِ فارسی سے قریب تر سمجھتے ہیں ، وہ اقبال کا

---

۱ ۔ علامہ اقبال : پیام مشرق (لالہ طور) مطبوعہ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور ، ۱۹۶۹ع ، ص ۸۱ ۔
۲ ۔ علامہ اقبال : زبور عجم ، چاپ شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاہور ۔ ۱۹۷۰ع ، ص ۱۷۶ ۔

ایجاد کیا ہوا سبک شعر اقبال ہے (جو نہ صرف پاک و ہند کی فارسی ادبیات کی تاریخ بلکہ تمام دنیائے ادب میں عصر حاضر کی فارسی شاعری کی تاریخ میں مقامِ یگانہ رکھتا ہے) - یہی وجہ ہے کہ اہلِ ایران اقبال کو قطعاً اجنبی نہیں پاتے - خصوصاً آج کا ہر ایرانی ادیب اور شاعر ، جو اقبال شناس ہے ، وہ معتقد اقبال نظر آتا ہے - مثلاً ادبیات جدید فارسی کے مشہور مفکر ، نقاد اور شاعر ''ملک الشعرأ بہار'' جو خود علامہ اقبال کے ہم عصر تھے ، اقبال کو عصر حاضر کا ایک بہت بڑا مفکّر ، فلسفی اور شاعرِ انقلاب سمجھتے ہیں ، جس کا اظہار انہوں نے اشعار ذیل میں یوں کیا ہے :

عصرِ حاضر خاصۂ اقبال گشت
واحدی از صد ہزاران بر گزشت[۱]
شاعران گشتند جیشی تار و مار
وین مبارز کرد کار صد سوار

اسی طرح ایران کے ایک اور شاعر آقای دکتر قاسم رسا اقبال کے متعلق اپنا نظریہ یوں پیش کرتے ہیں :

سرزد از لاہور رخشان اختری
آنکہ پاکستان ہمی نازد بروٗ[۲]
شاعری شیرین کلامِ نکتہ سنج
عارف روشن دل و پاکیزہ خو

یعنی اقبال ایک ایسا درخشندہ ستارہ ہے جو خطۂ لاہور سے نمودار ہوا اور جس پر تمام پاکستان کو ناز ہے - اور یہ شیریں کلام

---

۱ - ملک الشعرا بہار -

۲ - دکتر قاسم رسا : نظم بیادِ اقبال ، ایران میں اقبال شناسی کی روایت ، مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر ، ص ۲۳۴ -

اور نکتہ سنج شاعر نہ صرف عارفانہ کلام کہتا ہے بلکہ ایک روشن اور پاکیزہ دل بھی رکھتا ہے ۔ اس نے ایک جگہ علامہ کا گوئٹے سے مقابلہ کرتے ہوئے یوں بھی کہہ دیا ہے کہ شاعرِ مغرب گوئٹے کا جواب دینے میں ہمارا شاعرِ مشرق اقبال گوے سبقت لے گیا ہے ۔ اس کا اظہار اس نے یوں کیا ہے :

در سخن از شاعر مغرب زمین
شاعر مشرق زمین بربود گو[1]

ایران کے ایک اور شاعر آقای کاظم رجوی تو کلام اقبال سے اس قدر متاثر ہیں کہ انھیں اقبال میں روحِ ایرانی اور ان کے اشعار میں زبان پارسی کا حسن جلوہ گر نظر آتا ہے ۔ ان کے افکار میں مولوی رومی ، سعدی اور حافظ کی شیریں کلامی اور سحر انگیزی جھلکتی ہے ۔ کاظم رجوی نے ان تمام احساسات کا اظہار مندرجہ ذیل اشعار میں یوں کیا ہے :

روح او ایرانی است و گفتہ ہایش پارسی
فیض ہا دریافتہ از چشمۂ سیال او[2]
والہ و شیدائی حسنِ زبانِ فارسی
فتنۂ این شاہد شعر استَ و خطَ و خال او
مولوی و سعدی و حافظ تجلی کردہ اند
در ہمہ افکار و در آمال و در امیال او

جہاں تک آقای صادق سرمد ، شاعرِ ملی ایران ، کے اقبال سے

---

۱ ۔ آقای دکتر قاسم رسا : نظم بیاد اقبال ، ایضاً ص ۲۳۴ ۔
۲ ۔ آقای کاظم رجوی : نظم درباره اقبال ۔ ایران میں اقبال شناسی کی روایت ، مرتبہ ڈاکٹر سلیم اختر ، ایضاً ص ۲۲۹ ۔

والہانہ عشق کا تعلق ہے تو وہ اقبال کے مداح ہی نہیں بلکہ عاشق بھی تھے ۔ آقای صادق سرمد اقبال کی طرح قوم کا درد رکھنے والے شاعر ہیں ، لہذا اہلِ ایران آج بھی انھیں شاعرِ ملی ایران کے لقب سے یاد کرتے ہیں ۔ قیامِ پاکستان کے بعد آقای صادق سرمد ۱۰ مارچ سنہ ۱۹۵۰ عیسوی کو لاہور تشریف لائے تھے ۔ مجھے آج تک وہ منظر نہیں بھولتا جب کہ وہ شالیمار باغ میں شہر لاہور کی طرف سے دیے گئے ظہرانے میں موجود تھے اور انھوں نے ایک غزل اہلِ لاہور کے سامنے فی البدیہہ پڑھی تھی جس کے چند اشعار یہ ہیں کہ :

چون قدم بر مقدمِ آن ماہِ پنجابی زدم
سجدہ بر آن قبلۂ ابروی محرابی زدم[1]

شہر لاہوتی لاہورم بہشت آمد بچشم
وز صفائش راہ رنج و راہ بیخوابی زدم

تاب حسنش گرچہ در تاب و تب عشقم بسوخت
حاش للہ گر کہ یکدم ، دم ز بی تابی زدم

پھر ایک قصید، اہلِ پنجاب سے خطاب کرتے ہوئے پڑھا جس کا مطلع یہ ہے :

ای مسلمانان پنجابی زہی اقبالتان
کز دم اقبالتان ، مقبول شد آمالتان[2]

نغمۂ اقبال تان سوی قطار آورد باز
ای مسلمانان پنجابی زہی اقبال تان

---

۱ - صادق سرمد شاعر ملی ایران : درای کاروان، ص ۱۹ -
۲ - صادق سرمد : درای کاروان - ایضاً ص ۱۷ -

یعنی اے پنجابی مسلمان بھائیو ! تم خوش نصیب ہو کہ جنھیں اقبال جیسا شاعر نصیب ہوا اور جس نے تمھاری شیرازہ بندی کر کے تمھیں راہِ ترقی کی ایک قطار میں لا کھڑا کیا ۔ دوبارہ جنوری سنہ ۱۹۵۵ء میں جناب آقای صادق سرمد شاعر ملی ایران سے میری ملاقات لاہور میں ہوئی ۔ ایک روز فلیٹی ہوٹل کے کمرے میں بیٹھے ہوئے علامہ اقبال کا ذکر شروع ہوا تو چشم دید واقعہ یہ ہے کہ وہ اقبال کی یاد میں اتنا محو ہوئے کہ اپنے آپ میں گم ہو گئے اور اسی عالم میں ان کے لبوں سے فی البدیہہ یہ دو شعر نکلے جنھیں میں نے قلم بند کر لیا :

ما دو برادریم کہ در مہدِ روزگار
پروردگان دامن یک مادر آمدیم
ما دو برادریم کہ در سیر حادثات
ہم داستان و ہم قدم و ہمسر آمدیم

مختصر یہ کہ ایران کے تمام دانشور اور اقبال شناس شعرا و ادیب اقبال کے دل سے معتقد ہیں ۔ ان میں سے خاص طور پر جناب حبیب یغمائی ، ملک الشعراء بہار ، آقای ادیب برومند ، رضا زادہ شفق ، لطف علی صورت گر ، بدیع الزمان فروزانفر ، دکتر سعید نفیسی ، آقای کاظم رجوی ، داؤد شیرازی اور مرحوم صادق سرمد شاعر ملی ایران کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں ۔ مرحوم آقای صادق سرمد شاعر ملی ایران تو اقبال کو شہرۂ عام اور بقائے دوام کا درجہ دیتے ہیں اور اسے حیاتِ ابدی عطا کرتے ہوئے دل کی گہرائی سے یوں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں کہ اگرچہ انسان مہ و سال کی گردش میں مر جاتا ہے لیکن اقبال نہ کبھی مرا ہے اور نہ کبھی

مرے گا ، بلکہ وہ زندۂ جاوید ہے ۔ اس کا اظہار انھوں نے اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے :

اگرچہ مرد بمیرد بگردشِ مہ وسال
نمردہ است و نمیرد محمد اقبال" ۱

خلاصہ یہ ہے کہ اقبال ایران کی نظر میں اہل ایران کا اپنا شاعر ہے ۔

★ ★ ★

---

۱ ۔ صادق سرمد : در ای کاروان با مقدمہ دکتر حسین خطیبی ، ص ۲۳ ۔

۸

اقبال اور صادق سرمد شاعرِ ملی ایران

ایران کے دورِ مشروطیت کے مشہور شاعر ملک الشعرا بہار نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ویسے تو عصرِ حاضر میں بے شمار شعرا ہیں لیکن علامہ اقبال نے آزادی طلبی کے میدان میں ایک تنہا شاعر ہونے کی حیثیت سے سیکڑوں مجاہدین کا کام کیا ہے۔ ملک الشعرا اپنے جذبات کا اظہار یوں کرتے ہیں :

عصرِ حاضر ، خاصۂ اقبال گشت
واحدی ، کز صد ہزاراں برگزشت
شاعراں گشتند جشنِ تار و مار
ویں مبارز کرد کارِ صد سوار[1]

علامہ اقبال کے فارسی کلام نے ایران کے نہ صرف ملک الشعرا بہار ، بلکہ دیگر انقلابی شعرا کو بھی بہت متاثر کیا جنھوں نے علامہ اقبال کی انقلابی شاعری کا خود اعتراف کیا ہے۔ ان میں سے آقای کاظم رجوی ، داؤد شیرازی اور بالخصوص آقای صادق سرمد شاعرِ ملیِ ایران کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اہلِ پاکستان بالعموم اور اہلِ لاہور بالخصوص ۱۰ مارچ ۱۹۵۰ع کا دن فراموش نہیں کرسکتے۔ اس دن ایران کے کچھ دانش ور ، ادیب اور شعرا لاہور کے تاریخی شالامار باغ میں اہلِ لاہور کے

۱۔ مجلہ "سروش" ، اسلام آباد۔

مہمان ہوئے ۔ جس جذبے اور جوشِ محبت سے پاکستانی اور ایرانی ادیب شعرا ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے وہ منظر قابلِ دید تھا ۔ یہ وہی دن تھا جب مرحوم صادق سرمد شاعرِ ملی ایران نے فی البدیہ پنجابی مسلمانوں کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک قصیدہ پڑھا جس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں :

ای مسلمانانِ پنجابی زهی اقبالتان
کز دمِ اقبالتان مقبول شد آمالتان
نغمۂ اقبال تان سوی قطار آورد باز
ای مسلمانانِ پنجابی زهی اقبالتان
گر چراغِ لالۂ صحرائی اقبالی نبود
شمع آن محضر نمی شد روشنی حالتان
فکرِ خود کردید ، اسرارِ خود آموختید
لا جرم بے خود نہ شد نزدِ خدا اعمالتان[1]

صادق سرمد کا تعارف :

آپ کا اصل نام صادق اور تخلص ''سرمد'' ہے ۔ صادق سرمد ایران کے ایک صوفی منش بزرگ میرزا نصراللہ خان کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۔ آپ کے والد کا نام سید محمد علی تھا جو خود بھی صاحبِ ادب و عرفان تھے ۔ آپ ۱۲۸۶ شمسی میں پیدا ہوئے ۔ ایک ایرانی تذکرہ نویس ڈاکٹر صبور[2] اپنے مشہور تذکرے ''صدف ، ساعتی با شاعر یعنی تذکرہ ای از سخن ورانِ روز'' میں رقم طراز ہیں کہ

۱۔ صادق سرمد : درای کاروان ، ص ۱۷ ۔
۲۔ دکتر صبور : ''صدف ، ساعتی با شاعر یعنی تذکرہ ای از سخن وران روز'' (تہران : کتاب خانۂ ابن سینا) ، چاپ اول ، ص ۳۰۴ - ۳۰۶ ۔

صادق سرمد نے گیارہ برس کی عمر سے ہی شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور آپ کو شعر گوئی کا ملکہ خدا کی طرف سے ودیعت کیا گیا تھا۔

آپ نے اعلیٰ تعلیم ''رشتہ حقوق'' یعنی قانون میں حاصل کی، لیکن شعر گوئی کا ملکہ آخر دم تک قائم رہا۔ پہلے آپ نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا، پھر کچھ عرصہ منصب یعنی جج بھی رہے۔ پھر ''ہیئات مدیرۂ کنون'' یعنی دستور ساز اسمبلی کے رکن بھی رہے۔

صادق سرمد اہلِ دل، متین، سنجیدہ اور نہایت ذہین دانش ور تھے۔ فطرتاً وہ شاعر تھے۔ اسی لیے فی البدیہہ اشعار کہنے کا ملکہ رکھتے تھے۔ آپ کے کلام میں پختگی پائی جاتی ہے۔ آپ کا اسلوب بیان کلاسیکی ہے۔ آپ کے کلام میں فردوسی، سعدی، حافظ اور مولانائے روم کے افکار کی بلندی بھی دکھائی دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صادق سرمد کو اسی فکر اسلامی نے، جو انھیں مذکورہ اساتذہ کے کلام سے نصیب ہوا، شاعرِ ملیِ اسلام علامہ اقبال کے فارسی کلام کی طرف متوجہ کیا اور وہ علامہ اقبال کے فکارِ اسلامی سے اتنا متاثر ہوئے کہ تصور اقبال یعنی پاکستان اور اہلِ پاکستان کو دیکھنے کے لیے مجبور ہوگئے۔ وہ پہلی مرتبہ مارچ ۱۹۵۰ع میں اور پھر جنوری ۱۹۵۵ع میں لاہور تشریف لائے تھے۔

بقول ڈاکٹر صبور، صادق سرمد کے دو قطعے ''حدیثِ عشق'' اور ''نقشِ عشق'' کے عنوان سے بہت مشہور ہیں۔ ایک مثنوی بعنوان ''کبوتر علم'' بھی ہے جو انھوں نے بو علی سینا کے مزار پر سنہ ۱۳۳۳ خورشیدی میں کہی۔ یہ تصانیف فی الحال ہمیں پاکستان میں

دستیاب نہیں ہیں ، البتہ ان کا ایک شاہ کار مجموعۂ کلام "درای کاروان" کے عنوان سے موجود ہے ، جس میں انھوں نے علامہ اقبال ، قائدِ اعظم اور اہلِ پاکستان کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے ۔

اقبال اور سرمد :

حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال کی فارسی شاعری نے ایران کے انقلابی اور مفکر شعرا کے ذہنوں اور دلوں پر گہرا اثر کیا ۔ اس کے شواہد ''تاریخِ ادبیاتِ ایران'' میں عام ملتے ہیں ، چنانچہ اسی ضمن میں صادق سرمد شاعرِ ملیِ ایران کے وہ اشعار جو انھوں نے علامہ اقبال سے متاثر ہو کر کہے یا اہلِ پاکستان کی محبت میں کہے ، ایران کے ایک دانش ور ڈاکٹر حسین خطیبی نے ''درایِ کاروان'' کے عنوان سے ایک مجلے میں شائع کیے ہیں ۔ جب آقای صادق سرمد شاعر ملی ایران دوبارہ جنوری ۱۹۵۵ء میں شہر لاہور تشریف لائے تو انھوں نے راقم الحروف کو ''درایِ کاروان'' کا ایک نسخہ بھی مرحمت فرمایا ۔

صادق سرمد کے ان اشعار کے بغور مطالعے سے معلوم ہو گا کہ صادق سرمد کو علامہ اقبال سے نہ صرف عقیدت ہے بلکہ وہ ان کے کلام سے خود بھی شدید متاثر ہیں ۔ مثلاً وہ ایک جگہ پاکستان اور ایران کے تاریخی پس منظر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ صدیوں تک ہم آپس میں بھائی بھائی رہے ہیں اور ہمارا نظریۂ حیات ایک ہے ۔ ہم اپنے دشمنوں کے مقابل ہم قدم ہو کر جہاد کرتے رہے اور ہمارے مجاہد آپ کے مجاہدین کے شانہ بشانہ کفر کے مقابل جنگ کرتے رہے ۔ صادق سرمد ان جذبات کا یوں اظہار کرتے ہیں :

قرنہا طی شد کہ ما باہم برادر بودہ ایم
شاہد احوالہان ، اقوالہان ، اقوالتان
ہر طرف رفتیم و با دشمن بجنگ آویختیم
ہم قدم بودیم و یار ابطالہان ابطالتان[۱]

جس طرح علامہ اقبال نے "جوانانِ عجم" سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا :

چوں چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما
ای جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شما[۲]

تو صادق سرمد نے اس کا جواب دیتے ہوئے علامہ اقبال کے اشعار کی تقلید میں شعر کہے اور یوں فرمایا کہ جب تک عجم کی سر زمین میں اقبال کا روشن کیا ہوا یہ "چراغِ لالہ" روشن رہے گا ، ایران کی محبت بھی اہلِ پاکستان کے ساتھ ماہِ تاباں کی طرح چمکتی رہے گی اور ہم نے پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد جب سے عہدِ الفت باندھ لیا ہے تو پھر ہماری تمام تر ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہمیشہ قائم و دائم رہیں گی - ہمارا اور آپ کا پیمانِ محبت ایک ہے - ان جذبات کا اظہار صادق سرمد یوں کرتے ہیں :

تا چراغِ لالہ سوزد در خیابانِ عجم
مہر ایران یار شد با ماہِ تابانِ شما[۳]

---

۱ - صادق سرمد : درای کاروان ، ایضاً ص ۱۸ -
۲ - علامہ اقبال : "زبورِ عجم" ، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۷۰ء ، ص ۱۷۶ -
۳ - صادق سرمد : درای کاروان ، ایضاً ص ۴۴ -

ما کہ در بزم محبت عہدِ الفت بستہ ایم
روزِ ہمدردی چہ عہد ما و پیمانِ شما[1]

جہاں تک فارسی شاعری کا تعلق ہے ، صادق سرمد شاعرِ ملیِ ایران کی فارسی شاعری کا معیار علامہ اقبال کی شاعری کے معیار سے فنی اور فکری اعتبار سے تو لگا نہیں کھاتا ، البتہ یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ صادق سرمد کی شاعری میں علامہ اقبال کی شاعری کا گہرا تاثر جھلکتا دکھائی دیتا ہے ، اور علامہ اقبال کی طرح ملتِ اسلامیہ کے اتحادِ فکری کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے ۔ اس کے علاوہ اہلِ پاکستان کے لیے بالخصوص ان کے اشعار ایران کے عوام کی مخلصانہ محبت اور خلوص کا پیغام بھی دیتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ صادق سرمد کے اشعار اہلِ پاکستان کے لیے گہری دل چسپی کا باعث ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایران کا یہ انقلابی شاعر اہلِ پاکستان کے لیے کتنی محبت اور خلوص کے جذبات رکھتا ہے ، مثلاً جب وہ پاکستان کے دانش وروں ، ادیبوں اور شعرا سے ملے تو انھیں یوں محسوس ہوا کہ گویا مہمان اور میزبان میں کوئی فرق نہیں اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم سب ایک ہیں ۔ انھوں نے ان جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے فرمایا :

ما مسلمانیم و بر خوانِ مسلمان آمدیم
یعنی امشب میزباں را فرق از مہماں نبود[2]

اور ایک جگہ یوں بھی کہا :

---

۱ ۔ صادق سرمد : درای کاروان ، ایضاً ص ۴۴ ۔
۲ ۔ ایضاً ، ص ۱۴ ۔

میہمان شد میزبان و میزباں شد میہمان
آفرین بر میہمانداران ز میہمانِ شما[1]

ایک قصیدے میں صادق سرمد پاک و ایران کا تاریخی پس منظر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اگر آپ پاکستان و ایران کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو آپ کو عجیب معرکۃ الآرا فتوحات دکھائی دیں گی۔ ایسا کیوں تھا؟ اس لیے کہ ہمارے آبا و اجداد خط ایمان کے اسرار و رموز سے بخوبی واقف تھے۔ کوئی ملک بھی بغیر عدل و انصاف کے قائم نہیں رہ سکتا اور کوئی قوم بھی بغیر فضلیت کے صاحبِ فرمان نہیں ہو سکتی۔ اگر ایران سے غزنویوں کا جہاد نہ ہوتا تو پھر ہندوستان کے شاہنشاہوں کے سروں پر عدل و انصاف کا تاج بھی دکھائی نہ دیتا۔ اس کا اظہار یوں کرتے ہیں:

گر بہ تاریخِ جہاں با چشمِ ایماں بنگری
طرفہ ہا بینی کہ در بینائی چشم آن نبود
گر نبود آزادگاں را سر خط ایمان بدست
ایں ہمہ نقشِ عجب بر صفحۂ دوران نبود
ہیچ ملکی بی قوام معدلت قائم نگشت
ہیچ قومی بی فضیلت صاحبِ فرمان نبود[2]

اسی طرح ایک اور جگہ صادق سرمد نے علامہ اقبال کی تقلید میں اتحادِ عالمِ اسلامی کے موضوع پر اشعار کہے ہیں۔ مثلاً اقبال کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

ما ز نعمت ہای او اخوان شدیم
یک زبان و یک دل و یک جان شدیم

---

۱ - ایضاً ص ۴۴ -
۲ - ایضاً ص ۱۳ -

اسی موضوع کو صادق سرمد نے اپنے اشعار میں یوں منظوم کیا ہے :

ہم زبان و ہم نژاد و ہم دل و ہم مذہبیم
زان یک قومیم و خویشاوندِ ایل و آل تان[1]

صادق سرمد اس بات کا بھی معتقد ہے کہ اگر علامہ اقبال ایک مفکر اور شاعرِ حقیقت دان نہ ہوتے تو آج پاکستان کا جھنڈا کبھی نہ لہلہا رہا ہوتا ۔ اس کا اظہار وہ یوں کرتا ہے :

پرچم اقبالِ پاکستان نبود در اہتزاز
گر چہ اقبالش سخن گوی حقیقت داں نبود[2]

اور ایک جگہ یوں بھی کہا ہے :

سخن سرائی اقبال اگر نبود ، نبود
لوایِ لشکرِ پاکان سرودِ استقلال[3]

مختصر یہ کہ صادق سرمد علامہ اقبال کی فارسی شاعری سے اتنا متاثر اور معتقد دکھائی دیتا ہے ، کہ اس کی نگاہ میں اگرچہ علامہ اقبال مادی طور سے تو اس جہانِ فانی سے رحلت کر گیا ہے لیکن اقبال نہ تو مرا ہے اور نہ ہی کبھی مرے گا ۔ وہ ہمیشہ زندہ ہے ۔ اس کا اظہار صادق سرمد نے اس شعر میں نہایت خوب صورت انداز میں کیا ہے :

---

۱ ۔ صادق سرمد : درای کاروان ، ایضاً ص ۱۸ ۔
۲ ۔ ایضاً ، ص ۱۳ ۔
۳ ۔ ایضاً ، ص ۲۳ ۔

اگرچہ مرد بمیرد بگردشِ مہ و سال
نمردہ است و نمیرد محمد اقبـــال[1]

آقای صادق سرمد شاعر ملی ایران نہ صرف اقبال کا ہی معتقد اور عاشق تھا بلکہ وہ پوری پاکستانی قوم کا والہ اور شیدا تھا۔ صادق سرمد ۲۶ جولائی ۱۹۶۰ع کو اس جہان فانیٔ سے رحلت کر گیا، لیکن ہم بقول علامہ اقبال یہ ضرور کہیں گے کہ اگرچہ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں لیکن ہماری آنکھیں ضرور کھول دیں:

ای بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشمِ خود بر بست و چشمِ ما کشاد

* * *

---

۱ - صادق سرمد: درای کاروان، ایضاً ص ۲۳۔

۹

اقبال اور اتحاد عالم اسلامی

اقبال کا شمار نہ صرف دنیا کے بڑے شاعروں اور فلسفیوں میں کیا جاتا ہے بلکہ دنیا والے اسے ایک مفکر کی حیثیت سے بھی یاد کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا شمار نہ صرف اہل پاکستان بلکہ تمام دنیائے اسلام کے ان سیاسی رہنماؤں میں بھی کیا جاتا ہے جنھوں نے خدائے لم یزل کے "اخوت المسلمین" کے پیغام کو "اتحاد عالم اسلامی" یعنی پان اسلامیزم (Pan Islamism) کی صورت میں پیش کیا۔

حق تو یہ ہے کہ سید جمال الدین افغانی نے پان اسلامیزم یعنی "اتحاد عالم اسلامی" کا جو تصور پیش کیا تھا، اس میں روح پھونکنا اقبال ہی کا کام تھا۔ وہ ایک ایسا نازک دور تھا جب کہ اقبال کی قوم مکمل دو سو برس سے غلامی کی آہنی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی، اور اس پر بے حسی کا عالم طاری تھا، چنانچہ اقبال کی حقیقت بین نگاہ اس قوم پر پڑی اور اس کے بحرِ تفکر میں ایک ہیجان سا بپا ہوگیا اور وہ یک لخت پکار اٹھا:

قوم گویا جسم ہے، افراد ہیں اعضائے قوم
منزلِ صنعت کے رہ پیما ہیں دست و پائے قوم
محفلِ نظمِ حکومت، چہرۂ زیبائے قوم
شاعرِ رنگیں نوا ہے، دیدۂ بینائے قوم

مبتلائے درد کوئی عضو ہو روتی ہے آنکھ
کس قدر ہمدرد سارے جسم کی ہوتی ہے آنکھ

اس کی دور رس نگاہ نے فوراً جانچ لیا تھا کہ قوم کو ایک مخلص اور دردمند رہنما کی ضرورت ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی کراہتی ہوئی قوم ایک حکیم ملت کی متلاشی ہے۔ وہ خود حکیم ملت بنا اور اس نے قوم کی نبض پر ہاتھ رکھا اور ایک درد اور کسک سی محسوس کی تو اس کے دل سے یہ صدائے درد نکلی:

سر زمین اپنی، قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق آمیز ہے

کبھی اس نے ہندی مسلمانوں کے منتشر شیرازے کو راہ گم کردہ کی طرح بھٹکتے دیکھا اور جب انھیں کوئی راستہ نہ ملا تو اس نے انھیں دور سے آواز دی، کہ اے قافلے والو ادھر آؤ، اپنے منتشر شیرازے کو اکٹھا کرو اور ایک کاروان کی صورت اختیار کر لو۔ چلے آؤ چلے آؤ، میری آواز پر چلے آؤ، اور ایک کاروان بن جاؤ۔ اب اسے بھی کچھ امید کی جھلک نظر آئی تو اس نے کہا:

ہجومی بود رہ گم کردہ در دشت ز آوایِ درایم کاروان شد

اب اس کے کانوں میں سید جمال الدین افغانی کا وہ پیغام گونج رہا تھا جو برسوں سے خوابیدہ قوم کے جگانے کے لیے ایک بانگ درا کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس وقت اس نے اس بزرگ ہستی کو پکارا جس کی گفتار سے سنگ و سفال بھی جی اٹھتے، جس نے ایک ایسے اتحاد عالم اسلامی کا پیام دیا جس میں نہ کسی حسب و نسب پر فخر اور نہ ہی خون و رنگ میں امتیاز تھا۔ اقبال نے اس مقدس بزرگ کی شام زندگی

کو بھی بغور جھانک کر دیکھا تو اُسے اُس کی شام زندگی ، صبح فرنگ سے روشن تر نظر آئی اور وہ پکار اُٹھا :

سید سادات ، مولانا جمال زند، از گفتار او سنگ و سفال
اضطراب شعلہ بخشد دود را سوز و مستی میدھد داؤد را
عالمی بی امتیازِ خون و رنگ شام او روشن تر از صبح فرنگ

اقبال نے اس اتحاد عالم اسلامی کے پیام میں روح پھونکنے کے لیے سب سے پہلے نوجوان مسلم کو اُن کے اباو اجداد کی پر شکوہ زندگی سے تقابل کرتے ہوئے انھیں اس طرح جھنجوڑا :

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار ، وہ کردار ، تو ثابت ، وہ سیارا

پھر اس اتحاد عالم اسلامی کو مضبوط کرنے کی غرض سے اپنی قوم میں حسب و نسب اور خون و رنگ کا امتیاز مٹانے کے لیے یہ کہا :

یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو ، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

کبھی اُن کے منتشر شیرازے کو دیکھ کر اس کا جی کڑھتا تو انھیں فرقہ بندی کا احساس دلاتے ہوئے کہہ اٹھتا :

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک
ایک ہی سب کا نبیؐ ، دین بھی ، ایمان بھی ایک

حرمِ پاک بھی ، اللہ بھی ، قرآن بھی ایک
کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

جب اس کی نگاہ ہندی مسلمانوں سے اٹھ کر ہمسایہ اسلامی ممالک پر پڑی تو اس نے افغانیوں ، ایرانیوں اور ترکوں کو مساوات محمدی ؐ کا پیغام دیا کہ نہ ہی تو ہم افغان ہیں ، نہ ترک ، نہ ایرانی اور نہ تورانی بلکہ سب سے پہلے ہم مسلمان ہیں اور اسی ایک شجر اسلام کی مختلف شاخیں ہیں ۔ اسلامی نقطۂ نظر سے رنگ و بو یعنی حسب و نسب کا امتیاز ہم پر حرام ہے ، لہٰذا اتحاد عالم اسلامی کے اس فلسفے کو اس نے ہمسایہ اسلامی ممالک کے مسلمانوں کے سامنے یوں پیش کیا :

نہ افغانیم و نہ ترک و تتاریم چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو، بر ما حرام است کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

یہ اقبال ہی تھا جس نے پان اسلامیزم یعنی اتحاد عالم اسلامی کے تصور کو تمام عالم اسلام کے آخری کونے تک باآواز بلند پہنچایا ، یہاں تک کہ اس کا یہ پیام ملک عرب کی ان سرحدوں تک جا پہنچا ، جہاں سے خود شجر اسلام کی یہ شاخیں نکل کر تمام دنیا میں پھیل چکی تھیں ۔ اس سر زمین کے ہادیٔ برحق نے نہ صرف عرب کے رہنے والے عربوں کو بلکہ آئندہ زمانوں میں آنے والی تمام نسلوں کو مساوات اور انسانیت کا آخری پیام دیا تھا ، کہ تمام دنیا کے انسان برابر ہیں ۔ نہ کسی گورے کو کالے پر فوقیت ہے نہ کسی امیر کو غریب پر بلکہ سب لوگ برابر ہیں ۔ اور اہل عرب

کو خاص طور پر متنبہ کیا کہ اگر عرب اس پر ناز کریں کہ ہم عرب ہیں تو انھیں ترک کر دیا جائے۔ لہٰذا اس خالق کل کے آخری نبیؐ کا یہ آخری پیغام جو اس نے دنیا والوں کے لیے بھیجا، اقبال نے اخوت، انسانیت اور مساواتِ محمدیؐ کے اسی پیغام کو مسلمانوں کے لیے یوں دہرایا:

تو ای کودک منش خود را ادب کن
مسلماں زادۂ ترکِ نسب کن
برنگ احمر و خون و رگ و پوست
عربؔ نازد اگر، ترکِ عرب کن

اقبال نے "اتحاد عالم اسلامی" کا رشتہ ہند کی سر زمین سے نکال کر روم و شام کی سرحدوں سے وابستہ کیا اور کہا:

شعب ما از ہند و روم و شام نیست مرز بوم ما بجز اسلام نیست

اقبال نے دنیا کے مسلمانوں کو بتایا کہ اگرچہ ہمارے رہنے کی جگہیں مختلف ہیں لیکن ہمارا دعویٰ حق بھی ایک ہے اور دل بھی ایک ہے:

اہلِ حق را حجت و دعویٰ یکیست خیمہ ہای ما جدا، دلہا یکیست

اقبال نے بتایا کہ ہماری مسلمان قوم کا رشتہ ستاروں کی طرح جدا جدا بھی ہے اور بام فلک پر ان تمام ستاروں کے جھرمٹ کی طرح ایک بھی ہے۔ ہماری نگاہ ایک اور اندیشہ و فکر ایک ہے، چنانچہ اس نے کہا:

رشتۂ این قوم مثل انجم است چوں نگہ ہم از نگاہ ما گم است
تیرِ خوش پیکان، یک کیشیم ما یک نما، یک بیں، یک اندیشیم ما

حقیقت تو یہ ہے کہ اقبال کی آنکھ نے آنے والے دور کی ایک

درخشاں تصویر دیکھ لی تھی جس کا اظہار اُس نے اپنے کلام میں اکثر کیا ہے۔ اُس نے اپنی قوم کو اپنے دور میں غلامی کی آہنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ضرور دیکھا تھا جس سے اُس کا دل کڑھتا بھی تھا، بیشک وہ اپنے دور کے لیے Pessimist یعنی افسردہ تھا لیکن آئیندہ زمانے کے لیے وہ آپٹمیسٹ (Optimist) یعنی اُمید پسند تھا، لہٰذا اُس نے آزادی کے جذبے کو برابر گرم رکھا کیونکہ اسے اپنی قوم کی کامیابی کا کامل یقین تھا اس لیے اُس نے اپنی قوم کو یقین محکم اور عمل پیہم کے اسلحہ سے لیس کر دیا تھا اور یہ پیغام دیا کہ:

یقیں محکم ، عمل پیہم ، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

یہی وجہ تھی کہ اُسے ظلمت شب میں اُمید کی کرن دکھائی دی تو اُس نے شامِ غم میں صبحِ عید کی یوں خوش خبری دی:

شامِ غم لیکن خبر دیتی ہے صبحِ عید کی
ظلمتِ شب میں نظر آئی کرن اُمید کی

اور پھر یہ کہا کہ:

راز اس آتش نوائی کا مرے سینے میں دیکھ
جلوۂ تقدیر میرے دل کے آئینے میں دیکھ

آخر میں اُس نے اپنی پیش گوئی کا دعویٰ پورے یقین سے ان الفاظ میں کیا ہے:

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

آج دیکھیے کہ اقبال کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف صحیح اور درست ثابت ہو رہی ہے۔ اس کا وہ خواب جو اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے دیکھا تھا، پاکستان کی صورت میں حقیقت بن کر نظر آیا۔ پھر اس کا وہ پیغام جو اس نے اپنے ہمسایہ اسلامی ممالک ایران اور ترکیہ کو دیا تھا وہ آر۔ سی۔ ڈی کی صورت میں خقیقت بن کر دکھائی دیا۔ دوسرا پیغام جو اس نے اہل عرب کو دیا، وہ اسی شہر لاہور میں ''اسلامک سمٹ'' کی شکل میں پورا ہوا۔ اب پاکستان الشاء اللہ العزیز دنیائے اسلام کا ایک مضبوط ترین قلعہ بن جائے گا جو نہ صرف اسلامی بلاک کی رہنمائی کرے گا، بلکہ اس خالق کل کے آخری نبی ؐ کے آخری پیغام یعنی مساوات انسانیت کو عملی جامہ پہنا کر تمام دنیا میں آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرے گا، جس کی پیش گوئی شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے ان واشگاف الفاظ میں کی تھی:

آٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے.

لیکن اس کے ساتھ ''اتحادِ ملی اسلام'' کا یہ پیغام بھی دیا کہ:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

آخر میں دنیائے اسلام کو ترقی کی منازل پر گامزن ہونے کے لیے مسلم نوجوانوں کو یہ درس حیات بھی دیا:

وقتِ آن است کہ آئینِ دگر تازہ کنیم
لوحِ دل پاک بشوئیم و ز سر تازہ کنیم

انشاء اللہ العزیز وہ وقت دور نہیں جب علامہ اقبال کی یہ پیش گوئی عملی جامہ پہن کر سامنے آئے گی:

من درین خاکِ کہن گوہرِ جان می بینم
چشمِ ہر ذرہ چو انجم نگران می بینم
دانۂ را کہ بآغوشِ زمین است ہنوز
شاخ در شاخ برومند و جوان می بینم
کوہ را مثلِ پرِ کاہ سبک می یابم
پرِ کاہی صفتِ کوہ گران می بینم

آخر میں فرمایا کہ:

انقلابی کہ نگنجد بہ ضمیرِ افلاک
بینم و ہیچ ندانم کہ چسان می بینم

★ ★ ★

۱۰

اسلامی بلاک ـــــ اقبال کی نظر میں

آج جب کہ پندرھویں صدی ہجری کا سورج طلوع ہو چکا ہے تو اس کے ساتھ ساتھ تاریخِ اسلام میں بھی ایک نئے باب کا آغاز ہو رہا ہے ۔ آج ہمیں چاروں طرف تمام اسلامی ممالک میں ایک اضطراب اور اجتہاد کی کیفیت دکھائی دے رہی ہے ـــ کہیں پاکستان اور بھارت کے درمیان مسئلۂ کشمیر ہے تو کہیں عرب اور اسرائیل کے درمیان مسئلہ بیت المقدس ۔ دراصل یہ کوئی علاقائی جنگ نہیں بلکہ ایک نظریاتی جنگ ہے جس کی بین دلیل یہ ہے کہ مسئلۂ بیت المقدس محض اہل عرب اور اسرائیل کے درمیان متنازعہ نہیں بلکہ بیت المقدس مسلمانوں کا قبلۂ اول ہونے کی حیثیت سے پورے اسلامی ممالک کا مسئلہ ہے ۔ اسی طرح افغانستان میں روس کی جارحیت اور توسیع پسندی کے خلاف افغان مجاہدین کا جہاد فی سبیل اللہ ایک نظریاتی جنگ ہے ۔

میں سمجھتا ہوں کہ عصرِ حاضر میں ملتِ اسلامیہ کے درمیان اضطراب و اجتہاد کی لہر کے محرک مفکرِ اسلام علامہ اقبال ہیں جن کی دور رس نگاہ نے آنے والے دور یعنی عصرِ حاضر کی عکاسی ، ایک پیش گوئی کی صورت میں "جوابِ شکوہ" میں پہلے ہی سے کردی تھی ۔ انہیں معلوم تھا کہ ایک روز عالمِ اسلام کا چمن خون شہدا کی لالی سے گلزار بن جائے گا اور جب بہار آئے گی تو گلستانِ اسلام

ہر قسم کے خس و خاشاک سے خالی ہو جائے گا ، اور یہ پیش گوئی اس وقت صحیح ثابت ہوگی جب کہ عالمِ اسلام کے گردوں کا رنگ عنابی ہوگا ۔ اس کا اظہار علامہ اقبال نے یوں کیا ہے :

دیکھ کر رنگِ چمن ہو نہ پریشاں مالی
کوکبِ غنچہ سے شاخیں ہیں چمکنے والی
خس و خاشاک سے ہوتا ہے گلستاں خالی
گل ہر انداز ہے خونِ شہدا کی لالی
رنگ گردوں کا ذرا دیکھ تو عنابی ہے
یہ نکلتے ہوئے سورج کی افق تابی ہے!!

پھر اس کی وضاحت یوں بھی کی :

اُمتیں گلشنِ ہستی میں ثمر چیدہ بھی ہیں
اور محرومِ ثمر بھی ہیں خزاں دیدہ بھی ہیں
سینکڑوں نخل ہیں کاہیدہ بھی بالیدہ بھی ہیں
سینکڑوں بطنِ چمن میں ابھی پوشیدہ بھی ہیں
نخلِ اسلام نمونہ ہے برومندی کا
پھل ہے یہ سینکڑوں صدیوں کی چمن بندی کا[۲]

نخلِ اسلام کو برومندی کا نمونہ بنانے کے لیے لازم تھا کہ پہلے اقبال ملتِ اسلامیہ کے راہ گم کردہ منتشر ہجوم کو اکٹھا کرتے ۔ پھر ایک بانگ درا کے توسل سے انھیں ایک منظم کارواں کی صورت میں اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے رہ نمائی کرتے ۔

---

۱ ۔ ''بانگِ درا'' ، ''جوابِ شکوہ'' ، ص ۲۲۹ ۔
۲ ۔ ''بانگِ درا'' ، ''جوابِ شکوہ'' ، ص ۲۲۹ ۔

چنانچہ انھوں نے ایسے ہی کیا۔

"پیامِ مشرق" میں لالہ طور کے عنوان سے قطعہ نمبر ۱۴۰ میں اقبال نے اس کا اظہار یوں کیا ہے:

عجم از نغمہ ہائے من جواں شد
ز سودایم متاعِ او گراں شد
ہجومے بود رہ گم کردہ در دشت
ز آوازِ درایم کاروان شد[1]

یہاں عجم سے مراد محض ایران نہیں ہے بلکہ اس میں تمام اسلامی ممالک شامل ہیں۔ عصرِ حاضر کی اسلامی دنیا میں جو "اسلامی بلاک" کا رجحان دکھائی دے رہا ہے اس کے محرک بھی اقبال ہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اقبال کا ذہن ابتدائی دور میں قومیت کے مغربی تصور یعنی نیشنلزم سے متاثر رہا ہے، لیکن پھر بالغ النظر ہونے کے بعد انھوں نے فکر ملی اسلامی کے زیر اثر اس قومیت یا وطنیت کے تصور سے کنارہ کشی کر کے واضح طور پر اتحادِ ملی اسلامی کا پیغام دیا ہے۔ اگر ہم علامہ اقبال کے افکار و اشعار کا بغور مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ تقریباً ۱۹۱۰ء سے لے کر ۱۹۳۰ء تک تو یہی کیفیت رہی، لیکن ۱۹۳۰ء کے بعد کی شاعری سے، جو انھوں نے اکثر و بیشتر فارسی میں کی، اقبال کی بالغ نظری کا پتا چلتا ہے۔

اس امر کی تصدیق خود علامہ اقبال کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے ۱۹۳۱ء میں "بمبئی کرانیکل" (۷، ستمبر تا

۱۔ علامہ اقبال: پیامِ مشرق، ایضاً لالہ طور، ص ۸۱۔

۳۱ دسمبر ۱۹۳۱ ع) کے نامہ نگار کو انٹرویو دیتے ہوئے دیا[1] :

"There is no doubt that my ideas about Nationalism have undergone a definite change. In my College days I was a zealous Nationalist which I am not now. The change is due to a maturer thinking. It is unfortunate that my later writings are all in Persian which is little understood in this country."

ترجمہ : "اس امر میں کوئی شک نہیں کہ قومیت کے بارے میں میرے خیالات میں قطعی نوعیت کی تبدیلی پیدا ہو چکی ہے۔ کالج کے زمانے میں میں پرجوش قوم پرست تھا، مگر اب ایسا نہیں ہے۔ یہ تبدیلی پختہ سوچ کی بنا پر ہے۔ بدقسمتی سے میری بعد کی تحریریں فارسی میں ہیں جو اس ملک میں نہیں سمجھی جاتی۔"[2]

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا چیز تھی جس کی وجہ سے علامہ اقبال کے ذہن میں یہ تبدیلی واقع ہوئی۔ دراصل وہ علامہ اقبال کے اس دور کے بدلتے ہوئے حالات تھے جن کی وجہ سے علامہ اقبال کو بھی اپنی بالغ نظری سے کام لیتے ہوئے تبدیلی کرنا پڑی۔ جب ہم اس دور کے سیاسی محرکات پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو برِ صغیر پاک و ہند میں مسلم لیگ اور کانگریس کی باہمی کش مکش تھی تو دوسری طرف ترکیہ میں۔ خلافت کے خاتمے پر، اس دور کی خلافت کا تصور وہ نہ رہا تھا جو اسلام نے پیش کیا تھا۔ لہٰذا اب لازم تھا کہ مختلف علاقوں میں بکھرے ہوئے

۱۔ ملاحظہ ہو *Letters and Writings of Iqbal*، ص ۵۸۔

۲۔ ترجمہ ڈاکٹر وحید قریشی : "اقبال اور پاکستانی قومیت" (لاہور، مکتبۂ عالیہ)، ص ۴۱۔

مسلمان پہلے اپنی اپنی جگہوں پر خود مضبوط ہوں، پھر اپنی اپنی ریاستوں کو مضبوط کر کے عالمی سطح پر متحد ہوں۔ اس موقع پر سید جمال الدین افغانی نے جو ملتِ اسلامیہ کو اتحادِ علمِ اسلامی کا تصور پان اسلامزم (Pan-Islamism) کی صورت میں پیش کیا تھا علامہ کے لیے ایک نئی معنویت رکھتا تھا۔ لہٰذا اقبال نے نہ صرف اسے دل سے قبول کیا بلکہ اس کی ترویج و توسیع بھی کی۔ اقبال کے اردو کلام میں بالعموم اور فارسی کلام میں بالخصوص اس کا اظہار عام ملتا ہے۔ مثلاً "رموزِ بے خودی" میں "ارکانِ اساسی ملیہ اسلامیہ کے رکن اول" توحید کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ملتِ ابراہیمی کی حیثیت سے ہماری ملت کی اساس کا انداز ہی اور ہے اور اس کی اساس ہمارے دل کے اندر مضمر ہے۔ اگرچہ ہم مختلف قبیلوں، اور جغرافیائی اعتبار سے مختلف سرحدوں میں بٹے ہوئے ہیں، لیکن ہمارے دین اسلام کا رشتہ ایک ہی ہے جس سے منسلک ہونے کے بعد ہم ایک ہی ملتِ اسلامیہ کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ یا یوں کہیے کہ ہم اس تیرِ خوش پیکاں کی مانند ہیں جس کے دو حصے جدا جدا ہیں ــ ایک تو تیر کا دستہ اور دوسری تیر کی نوک، لیکن جب ان دونوں کو جوڑا جائے تو تیرِ خوش پیکان کی مانند ایک تیر ہی کہلاتا ہے، یعنی جب ہم کلمۂ توحید کے رشتے میں منسلک ہوگئے تو این و آن کی قید و بند سے آزاد ہو گئے۔ پھر کوئی عجمی ہو یا عربی، کالا ہو یا گورا، ایرانی ہو یا تورانی، افغانی ہو یا پاکستانی، ہماری سوچ بھی ایک ہوگی، ہمارا دل بھی ایک ہوگا، ہمارا مدعا اور مآل بھی ایک اور ہمارا طرز و اندازِ خیال بھی ایک ہوگا۔ جب ہم میں ہم فکری اور ہم رنگی پیدا ہو جائے گی تو یقینی طور پر ہم خدا کی مہربانی سے بھائی بھائی بن جائیں گے اور ایک

زبان ، ایک دل اور ایک جان ہو جائیں گے ۔ اس تمام فلسفۂ اتحادِ ملی اسلام کا اظہار علامہ اقبال نے یوں کیا ہے :

ما مسلمانیم و اولادِ خلیلؑ
از ابیکم گیر ، اگر خواہی دلیل
ملّتِ مارا اساسِ دیگر است
این اساس اندر دلِ ما مضمر است
تیرِ خوش پیکان ، یک کیشیم ما
یک نما ، یک بین ، یک اندیشیم ما
مدعای ما ، مآلِ ما یکی ست
طرز و اندازِ خیالِ ما یکی ست
ما ز نعمت ہای اُو اخوان شدیم
یک زبان و یک دل و یک جان شدیم[۱]

پین اسلامزم (*Pan-Islamism*) اور سید جمال الدین افغانی :

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پین اسلامزم کا محرک کون تھا ؟ اس کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟ اس کی صورت پہلے کیا تھی اور اب کیا ہے ؟

پین اسلامزم کا مفہوم :

سب سے پہلے پین اسلامزم کا مفہوم پیش کرنا مناسب ہوگا ۔ پین (Pan) انگریزی زبان کا لفظ ہے ۔ یہ اسم اور فعل دونوں صورتوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ معروف لغت نویس ڈبلیو ۔ ٹی ۔ کننگھم

---

۱ ۔ ''کلیاتِ اقبال فارسی'' (''رموزِ بے خودی'') ، بہوسیلہی احمد سروش ، مطبوعہ کتابخانۂ سنائی ، تہران ۔ ص ۶۳ - ۶۴ ۔

The Nelson Contemporary English نے (W.T. Cunningum) *Dictionary* میں اسم کے اعتبار سے اس کے معنی فرائی پان یا ایک کٹھالی کے دیے ہیں جس میں سونا پگھلا کر اس سے میل اور ریت جدا کی جاتی ہے - جبکہ فعل کے مفہوم میں اس کے معنی ہلانے، صاف کرنے یا فلم یا ٹیلی ویژن پر کسی خاص موضوع کو سمجھانے کی خاطر فوکس یا کلوز اپ یعنی بڑا کر کے قریب سے دکھانے کے ہیں (ص ۳۵۸) -

لہٰذا اس اعتبار سے پین اسلامزم (*Pan-Islamism*) کا مفہوم خس و خاشاک کو دور کر کے خالص باعمل مسلمانوں کی تنظیم کے ہوئے -

پین اسلامزم کے محرک سید جمال الدین افغانی تھے -

اس کی ضرورت کیوں پیش آئی ؟ دراصل ترکیہ میں خلافت کے ختم ہونے پر ایک ایسی تحریک کی ضرورت تھی جو تمام اسلامی ممالک کو، خواہ وہ مشرق میں ہوں یا مغرب میں، اسلامی فکر کے رشتے میں منسلک اور متحد کر کے ایک باعمل خلافت کا احیا کر دے تاکہ پیغمبرِ آخر الزمان رسولِ مقبولؐ کے لائے ہوئے دینِ اسلام کو عملی طور پر نافذ کر کے ایک ایسا اسلامی بلاک قائم کیا جا سکے جس کی بنیاد ارکانِ اساسی ملیہ اسلامیہ پر ہو - پھر یقینی طور پر خدا کی جانب سے "اکملت لکم دینکم" کی زیرِ سرپرستی پین اسلامزم کا یہ اسلامی بلاک ایک ایسی سپر پاور ہوگا جو فطرتِ انسانی کے مطابق نہ صرف خود راہِ مستقیم پر چلے گا بلکہ تمام اقوامِ عالم کی رہ نمائی اور اعانت کرے گا -

پین اسلامزم کا مشتبہ مفہوم :

ایک فرانسیسی صحافی نے پین اسلامزم کا مفہوم یہ لیا کہ یہ تحریک تمام مسلمان ممالک کو اکٹھا کر کے عیسائی مملکتوں کے خلاف ایک سازش ہے - تاہم بقول علامہ اقبال کیمبرج یونی ورسٹی کے آں جہانی پروفیسر براؤن نے اس کے اس مشتبہ مفہوم کی تردید کی تھی -

مذکورہ اخبار ''بمبئی کرانیکل'' کے انٹرویو میں علامہ اقبال نے دسمبر ۱۹۳۱ء میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے پین اسلامزم کی وضاحت نہایت واضح اور مدلل انداز میں یوں کی تھی[1] :

"But there is another sense in which the word should be used and it does contain the teaching of the Qur'an. In that sense it is not a political project but a social experiment. Islam does not recognise caste or race or colour. In fact Islam is the outlook on life which has really solved the colour question, at least in the Muslim world, a question which modern European civilization with all its achievements in science and philosophy has not been able to solve. Pan-Islamism, thus interpreted, was taught by the Prophet and will live for ever."

اس کا اردو ترجمہ ڈاکٹر وحید قریشی نے یوں کیا ہے :

''لیکن اس سے ہٹ کر اسے ایک اور مفہوم میں استعمال کیا جا سکتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ مفہوم قرآنی تعلیمات کے عین مطابق ہے - اس صورت میں یہ کوئی سیاسی منصوبہ نہیں بلکہ سماجی تجربہ بن جاتا ہے - اسلام ذات پات اور رنگ و نسل کے امتیازات

۱- دیکھیں *Letters and Writings of Iqbal* ، ص ۵۵ - ۵۷ -

تسلیم نہیں کرتا بلکہ یہ صرف اسلامی نقطۂ نظر ہی ہے جس نے رنگ کے مسئلے کا کم از کم مسلم دنیا میں تو خاتمہ کر دیا ہے، جب کہ فلسفہ اور سائنس میں اپنی فتوحات کے باوجود جدید یورپی تہذیب اسی مسئلے کا حل تلاش کرنے میں ناکام رہی ہے۔ پین اسلامزم کی یہ تشریح آں حضرت صلعم کی تعلیمات کے عین مطابق ہے اور زندۂ جاوید رہے گی[۱]۔"

علامہ اقبال کے مذکورہ بیانات کے مطابق یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ علامہ اقبال کے فکر نے وطنیت سے قومیت اور پھر قومیت سے فکرِ اسلامی کی منزل تک جو ارتقائی مراحل طے کیے ہیں وہ ان کی بالغ نظری کی بین دلیل ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہی تدریجی فکری ارتقا علامہ اقبال کے اردو اور پھر فارسی کلام میں واضح نظر آتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اُن کی وہ تمام پیش گوئیاں جو اُنھوں نے ماضی، حال اور مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے کیں آج کافی حد تک صحیح ثابت ہو رہی ہیں۔ مثلاً جب ان کی نگاہ ماضی میں خلافتِ راشدہ کے صحیح نظامِ اسلامی پر پڑتی ہے تو اُس کے احیا کے لیے ملتِ اسلامیہ کو "بانگِ درا" میں "دنیائے اسلام" کے عنوان سے یوں پیامِ اجتہاد دیتے ہیں:

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر[۲]

جب ہم علامہ اقبال کے اس نظریے کو آج کے حوالے سے

۱۔ ڈاکٹر وحید قریشی: کتاب مذکورہ، ص ۱۰۲۔
۲۔ کلیاتِ اقبال اردو ("بانگِ درا")، ایضاً، ص ۲۶۵۔

دیکھتے ہیں تو یہ ایک عین حقیقت بن کر دکھائی دیتا ہے۔ عصرِ حاضر میں تمام اسلامی ممالک اسی نشاۃ ثانیہ کو حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

اقبال اور سید جمال الدین افغانی :

علامہ اقبال کے دل میں سید جمال الدین افغانی کے احترام کا اندازہ اُن کی شہرۂ آفاق فارسی تصنیف "جاوید نامہ" سے لگایا جا سکتا ہے جہاں "فلکِ عطارد" کے عنوان سے علامہ اقبال "زندہ رود" کی صورت میں اپنے پیرِ رومی کی قیادت میں جمال الدین افغانی اور ترک سالار سعید حلیم پاشا کی ارواح سے ملاقات کرتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ میں گیا اور میں نے دیکھا کہ دو شخص قیام کی حالت میں ہیں۔ اُن میں سے سعید حلیم پاشا مقتدی ہیں اور اُن کی امامت جمال الدین افغانی کرا رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر پیرِ رومی کا چہرہ ذوق و سرور کی کیفیت سے چمک اُٹھتا ہے۔ پھر رومی نے فرمایا کہ مشرق نے ان دو شخصیتوں سے بہتر اور کوئی شخصیت پیدا نہیں کی۔ ان کے ناخن نے ہماری مشکلات کا عقدہ کھولا ہے اور جہاں تک سید السادات مولانا جمال الدین افغانی کا تعلق ہے اُن کی گفتار میں وہ تاثیر ہے کہ سنگ و سفال بھی جی اُٹھتے ہیں۔ اُن کے نطق میں وہ تاثیر ہے کہ ابراہیم خلیل اللہ بھی وجد میں آ جائیں اور جبرائیل کی روحِ پاک بھی جھوم اُٹھے۔ اُن کی تاثیرِ گویائی سے دل بھی سینے میں تڑپ اُٹھیں اور یہاں تک کہ قبروں سے مردے بھی شورِ الا اللہ کے ساتھ جی اُٹھیں۔ اُن کی تقریر دھوئیں کو شعلۂ اضطراب بخشتی ہے اور یہاں تک کہ حضرت داؤدؑ بھی سوز و مستی میں جھوم اُٹھتے ہیں۔ ان کی گفتار سے تمام غیاب و اسرار آشکارا ہو جاتے ہیں

اور اُم الکتاب یعنی قرآن کے رموز و نکات کے حجابات اُٹھ جاتے ہیں۔
ان تمام احساسات کا اظہار علامہ اقبال نے یوں کیا ہے :

رفتم و دیدم دو مرد اندر قیام
مقتدی تاتار و افغانی امام
پیرِ رومی ہر زماں اندر حضور
طلعتش برتافت از ذوق و سرور
گفت مشرق زین دو کس بہتر نزاد
ناخنِ شان عقدہ ہای ما کشاد
سیّد السادات ، مولانا جمال
زندہ از گفتارِ او سنبک و سفال

قرأتی کز وی خلیل آید بوجد
روحِ پاکِ جبرئیل آید بوجد !
دل ازو ، در سینہ گردد ناصبور
شورِ الا اللہ خیزد از قبور !
اضطرابِ شعلہ بخشد دود را
سوز و مستی می دہد داؤد را
آشکارا ہر غیاب از قرأتش
بی حجاب اُم الکتاب از قرأتش ![1]

جمال الدین افغانی ہی کا یہ شعلۂ اضطراب تھا جس کی تڑپ نے علامہ اقبال کے دل کو ایسا گرمایا کہ اُنھوں نے برسوں سے سوئی ہوئی ملتِ اسلامیہ کو شورِ الا اللہ سے جگا ڈالا۔

۱۔ "کلیاتِ اقبال فارسی" ("جاوید نامہ") ، ایضاً ، ص ۳۰۳۔

اقبال اور عصرِ حاضر :

آج جب کہ چودھویں صدی ہجری کا اختتام ہے اور پندرھویں صدی ہجری کا آغاز ہو چکا ہے ، ہم علامہ اقبال کے کلام و افکار کا بغور مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ اقبال نے ملتِ اسلامیہ کی رہنمائی ایک بالغ نظر مفکرِ اسلام کی حیثیت سے کی ہے - یہی وجہ ہے کہ اُن کے افکار آج بھی ملتِ اسلامیہ کے لیے مشعلِ راہ ہیں - اقبال کی روحِ پاک آج بھی ملتِ اسلامیہ کو بہ بانگِ دہل "پیام مشرق" میں "نقشِ فرنگ" کے عنوان سے یہ پیغام دے رہی ہے :

وقت آن است کہ آئینِ دگر تازہ کنیم
لوحِ دل پاک بشوئیم و ز سر تازہ کنیم[1]

"لوحِ دلِ پاک بشستن" کا یہ پیام آج ہمارے برادر اسلامی ممالک ایران و عراق کے لیے وقت کی اہم ترین آواز بن گیا ہے - آج اقبال کی روح انھیں یہ پیام دے رہی ہے کہ اے مسلم ! اگر تو صاحبِ نظر ہے تو آنکھیں کھول اور دیکھ کہ زندگی ایک جہانِ دگر تعمیر کرنے میں مصروف ہے جبکہ تو آپس میں ہی جنگ آزما ہے - فرماتے ہیں :

چشم بکشای اگر چشم تو صاحب نظر است
زندگی در پیِ تعمیر جہانِ دگر است[2]

۱- ایضاً ("پیامِ مشرق") ، ص ۲۳۰ -
۲- ایضاً ، ص ۲۳۱ -

اقبال کا آپٹیمزم (Optimism) یعنی رجائیت :

میں سمجھتا ہوں کہ اقبال کے ہاں رجائیت کا پہلو اس لیے ابھر کر سامنے آتا ہے کہ اقبال کی نگاہ دور رس نے ملت اسلامیہ کی کیفیت کو ماضی، حال اور مستقبل کے آئینے میں رکھ کر بغور دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ''پیامِ مشرق'' کی نظم بعنوان ''پیام'' میں فرماتے ہیں :

من درین خاک کہن گوہرِ جان می بینم
چشمِ ہر ذرہ چو انجم نگران می بینم
دانہ ای را کہ بآغوشِ زمین است ہنوز
شاخ در شاخ برومند و جوان می بینم[1]

انھیں کامل یقین تھا کہ فکرِ بیداری ملتِ اسلامیہ کا وہ بیج جو انھوں نے بویا تھا، آنے والے زمانے یعنی آج عصرِ حاضر میں خاکِ کہن ملتِ اسلامیہ میں وہ پھوٹ پڑا ہے اور نئی نسل شاخ در شاخ برومند و جوان دکھائی دے رہی ہے۔ اور انھیں پندرھویں صدی ہجری کے مستقبل میں ملت اسلامیہ کے خاکِ کہن میں ہر ذرہ انجم کی طرح چمکتا اور دمکتا دکھائی دے رہا تھا۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ اقبال کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف پوری ہو رہی ہے۔

اقبال کا پیامِ عصرِ حاضر کے نام :

اس تمام بحث کا لبِ لباب اور ماحصل یہ ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ علامہ اقبال کے افکار کے تراجم کر کے تمام اسلامی ممالک میں کثرت اور تیزی سے بھیجے جائیں، تاکہ اس ''اسلامی بلاک''

۱۔ ایضاً پیامِ مشرق، ص ۲۳۱۔

کا خواب ، جو علامہ اقبال اور جمال الدین افغانی نے دیکھا تھا ، عملی طور پر پورا ہو سکے ۔ در اصل جمال الدین افغانی نے "پین اسلامزم" کی تحریک کا آغاز کیا تھا اور علامہ اقبال نے اس میں پیش رفت یہ کی کہ ملتِ اسلامیہ کی آنے والی نئی نسل کو "اسلامی بلاک" بنانے کے لیے ذہنی اور عملی طور پر تیار کر دیا ہے ، اور عصرِ حاضر کی نوجوان نسل کے نام یہ پیغام "بانگِ درا" میں "طلوعِ اسلام" کے عنوان سے یوں دیا ہے :

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو ، زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں ، وہ کارواں تو ہے

مکاں فانی ، مکیں آنی ، ازل تیرا ، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو ، جاوداں تو ہے !

یہ نکتہ سر گزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا ، عدالت کا ، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

ہمیں خدائے ذوالجلال کی رحمت سے یقینِ کامل ہے کہ اگر آج بھی ملتِ اسلامیہ علامہ اقبال کے اس عالم گیر پیام پر عمل پیرا ہو تو یقیناً پندرھویں صدی ہجری کا سورج "اسلامی بلاک" کی

U-109429

سرزمین پر علامہ اقبال کی اس پیش گوئی سے طلوع ہوگا:

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے!
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے!

* * *

بزمِ اقبال کی چند مطبوعات

۱ - **ذکرِ اقبال :** از عبدالمجید سالک - - - - - - - - -/۳۰
۲ - **فکرِ اقبال :** از ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم - - - - - - -/۵۰
۳ - **فلسفۂ اقبال :** مرتبہ بزمِ اقبال - - - - - - - - - -/۳۰
۴ - **شعرِ اقبال :** از سید عابد علی عابد - - - - - - - -/۳۵
۵ - **مطالعۂ اقبال :** مرتبہ گوہر نوشاہی - - - - - - - -/۴۵
۶ - **اقبال درونِ خانہ :** مؤلفہ خالد نذیر صوفی - - - - -/۳۰
۷ - **اقبال دیاں لَمیاں نظماں :** (منظوم پنجابی ترجمہ)
از خلیل آتش - - - - - - - - - - - - - - -/۱۰
۸ - **اقبال سید سلیمان کی نظر میں :**
مرتبہ پروفسر اختر راہی - - - - - - - - - - -/۲۶
۹ - **اقبال کی شخصیت اور شاعری :**
از پروفیسر حمید احمد خاں - - - - - - - - - -/۲۵
۱۰ - **اقبال کا فنی ارتقا :** مؤلفہ پروفیسر جابر علی سید - - - -/۱۴
۱۱ - **علم الاقتصاد :** پنجابی ترجمہ از پروفیسر شریف کنجاہی - -/۲۴
۱۲ - **اقبال ممدوح عالم :** از ڈاکٹر سلیم اختر - - - - - -/۴۴
۱۳ - **حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں :** از محمد عبداللہ قریشی - -/۴۰
۱۴ - **تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ :**
از سید نذیر نیازی - - - - - - - - - - - - -/۳۵
۱۵ - **مطالعۂ اقبال کے چند نئے رخ :** از ڈاکٹر سید عبداللہ - -/۴۰
۱۶ - **مطالعۂ اقبال کے چند پہلو :** از میرزا ادیب - - - - -/۲۵
۱۷ - **اقبال ــــ ایک مطالعہ :** از پروفیسر جابر علی سید - - -/۲۲
۱۸ - **اقبال اور تصوف :** از پروفیسر محمد فرمان - - - - - - -/۲۰

بزم اقبال ، کلب روڈ ، لاہور

اظہر سنز پرنٹرز ، لاہور